کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد
حیدرآباد

Volume:12 Issue:11 November 2019

مدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.idara.info

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

اشرف الجرائد کی توسیع و اشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ادارہ

اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (سورۃ البقرۃ:۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف)۔

تشریح: حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو پہلے علماء یہود میں سے تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو اسلام لانے کے بعد یہ خیال ہوا کہ شریعتِ موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعتِ محمدؐیہ میں اس کی تعظیم واجب نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال کے اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعتِ موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے گی اور شریعتِ محمدؐیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اس خیال کی اصلاح نہایت اہتمام سے فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابلِ رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً سَلم (زیر اور زبر کے ساتھ) دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح،

دوسرے اسلام، اس جگہ جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کے نزدیک اسلام مراد ہے۔ (ابن کثیر)۔

اس کے دو ترجمے اور مطلب ہو سکتے ہیں: ۱) ''تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ''، یعنی تمہارے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ل اور دماغ سب کا سب دائرہ اسلام میں اور اطاعتِ الٰہیہ کے اندر داخل ہونا چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکامِ اسلامیہ بجالا رہے ہو مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں، یا دل و دماغ سے تو اس پر مطمئن ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء وجوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

دوسرا ترجمہ ومطلب یہ ہوگا کہ ''تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں''، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو بعض میں پس وپیش رہے، اور چوں کہ اسلام نام ہے اس مکمل نظامِ حیات کا جو قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو، یا معاملات ومعاشرت سے، یا حکومت وسیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت وصنعت وغیرہ سے، اسلام کا جو مکمل نظامِ حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکامِ اسلام خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاءِ ظاہر سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ کروگے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہوگے۔

اس آیت کا شانِ نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مطمحِ نظر ہونا چاہیئے، اس کو پورا پورا اختیار کرلو تو وہ تمہیں سارے مذاہب وملل سے بے نیاز کردے گا۔

تنبیہ: اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزء ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دین داروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق ومعاملات اور خصوصاً حقوقِ معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے، نہ اُن کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ اُن پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ۔ کم از کم حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا مختصر رسالہ ''آداب معاشرت'' ہر مسلمان مرد وعورت کو ضرور پڑھ لینا چاہیئے۔ (ماخوذ: از معارف القرآن: ۱/ ۱۴۶، ۱۴۷)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے، اسلام کو مکمل طور پر اپنانے اور خود کو اسلام کا پورے طور پر پابند بنانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اس کے تقاضے

حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ العالی*

عَنْ أَنَسٍ رضی الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ". (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ اس کے دل میں میری محبت نہ ہوجائے۔

تشریح: مذکورہ روایت کے راوی خادم رسول، حضرت انس بن مالکؓ ہیں جو دس سال تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خادم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں: میری ماں (ام سلیم رضی اللہ عنہ) مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس لے گئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! انصار کے مردوں اور عورتوں نے آپ کو تحائف پیش کیے اور میرے پاس میرے اس بچے کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی جو میں آپ کو بطور تحفہ کے پیش کرتی۔ آپ میرے اس بچے کو قبول فرمالیں! یہ آپ کی خدمت کیا کرے گا، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں اس بات کی اجازت مرحمت فرمادی۔

ایک ایمان والے کو اپنے پیغمبر کے ساتھ کیسی محبت ہونی چاہئے، اور اس محبت کے کیا تقاضے ہیں؟ اس سلسلہ میں خادم رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مومنِ کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔ بالکل یہی مضمون قرآن مجید کی اس آیت میں بھی موجود ہے، حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں: آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جسے تم

---

* مہتمم دارالعلوم دیوبند

پسند کرتے ہو اگر یہ تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اور اس کی راہ کے جہاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لے آئے، اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔(التوبہ: 24)

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے نزدیک میری ذات کے بعد سب سے زیادہ محبوب آپ ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا والذي نفسي بيده حتى أكون أحب إليك من نفسك نہیں! بخدا تمہارا ایمان تب تک کامل نہیں ہے جب تک کہ میں تمہارے نزدیک تمہاری ذات سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: الآن أنت أحب الي من نفسي اب آپ میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا: الآن يا عمر! اے عمر! اب ایمان کامل ہے۔

معلوم ہوا کہ ہر بندۂ مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ضرور محبت ہونی چاہئے اور یہ محبت دنیا کی تمام محبوب چیزوں سے حتیٰ کہ اپنی عزیز جان سے بھی بڑھ کر ہونی چاہئے۔ جب تک کوئی شخص اس معیار پر پورا نہ اترے، اس کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ کتبِ سیرت میں صحابہ کرامؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت، جانثاری اور فداکاری کے بے شمار واقعات موجود ہیں جن کا مطالعہ ایمان میں تازگی اور یقین میں زیادتی کا سبب ہے۔

یہی خادم رسول حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارا ناس ہو! تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ تو انہوں نے کہا: میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس کے ساتھ ہو گے جس سے تم کو محبت ہو گی۔ صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حقیقتاً محبت کرنے والے تھے، ان کی محبت ہماری طرح صرف لفظی، اور دکھاوے کی نہیں تھی، بلکہ حقیقی محبت تھی، صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی حبِ رسول کی آئینہ دار تھی اور اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے کہ جس کے ساتھ سچی محبت ہو گی اسی کے ساتھ تمہارا حشر ہوگا، سچی محبت کا معیار یہ ہے کہ جتنی اپنے اندر طاقت وقوت ہے، اس کے مطابق اتباع سنت میں، شریعت کی پیروی میں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک طریقے اور ایک ایک ادا کو اختیار کرنے میں کوئی کمی نہ آنے دیں، یہی حقیقی محبت کا تقاضا ہے، اور صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی اسی محبت سے عبارت تھی، ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے علاوہ کوئی طریقہ قابل توجہ نہیں تھا، شریعت کے کسی حکم کے سامنے وہ کوئی چیز قبول کرنے والے نہیں تھے، تب ہی تو اللہ رب العزت نے ان کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنه کا مژدۂ جاں فزا سنایا تھا۔ آج ضرورت ہے کہ ہم حب رسول کے صرف زبانی نعروں کے بجائے حقیقی معنیٰ میں محب رسول بن کر دکھائیں!

پیش گفتار

مدارسِ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں جزوی ترمیم کی ضرورت

از: مدیر

مدارسِ اسلامیہ یا علم دین کے درس وتدریس کے مقصد کو مختصر انداز میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مدارس کا مقصد حفاظتِ دین اور اشاعتِ دین ہے؛ یعنی اسلامی عقائد واعمال ـــــ جن میں عبادات، معاملات، معاشرت، اور حکومت وسیاست سب شامل ہیں ـــــ کی تحقیق وتشریح اور تبلیغ وترویج!

حفاظت کا ذریعہ علومِ عالیہ ـــــ قرآن وحدیث، فقہ اسلامی اور ان کے اصول ـــــ اور علومِ آلیہ ـــــ اِن علوم میں مہارت کے لئے درکار معاون علوم ـــــ پر عبور اور مقاصدِ شریعت پر گہری نظر ہے، ان علوم کے حاملین کو مفسرین، محدثین اور فقہاء کہا جاتا ہے، اِن کا کام مقاصدِ شریعت اور مزاجِ شریعت پر گہری نظر رکھتے ہوئے کتابُ وسنت کی تفہیم وتعلیم اور حوادث ونوازل میں مسلمانوں کے مسائل کا حل نکالنا اور ضرورت کی تکمیل کرنا ہوتا ہے۔ یہ بنیادی اور نہایت اہم کام ہے، کتاب وسنت میں بھی اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے، جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کے مطابق علماء اِن علوم کے جامع بھی ہوسکتے ہیں اور کسی ایک علم میں متخصص بھی، صحابہ کرامؓ میں بھی ایسا تھا کہ بعض جامع تھے بعض متخصص اور بعد کے ادوار میں بھی اکثر علماء کا اپنا اپنا دائرہ کار مخصوص تھا مگر بہ حیثیتِ مجموعی مفسرین، محدثین اور فقہاء سب ہی تحفظِ دین کے فریضے کو انجام دیتے رہے، آج بھی پورے عالم میں اس شان کے علماءِ اسلام ہی تحقیق وتدریس کے ذریعہ علومِ اسلامیہ کو زندہ وتابندہ رکھے

ہوئے ہیں اور حفاظتِ دین کا فریضہ پوری ذمہ داری اور کمالِ یکسوئی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں، دنیا کی کوئی زیب وزینت اور نام نہاد ترقی کی چمک دمک اُن کو اپنی طرف مائل وراغب کرنے میں آج بھی کامیاب نہیں ہوسکتی ہے ۔حفظھم اللہ و کثر امثالھم۔

یہ تو تھا مدارس کے ذریعہ حفاظتِ دین کا پہلو! اور اشاعتِ دین کا مطلب مذکورہ علماء کے ذریعہ دین کی صحیح معلومات حاصل کرکے عامۃ المسلمین بلکہ حسبِ موقع غیر مسلمین تک بھی ان معلومات کو پہونچانا، ان پر عمل کی دعوت دینا اور اس کے لئے ممکنہ مباح ذرائعِ ابلاغ کا استعمال کرنا ہے، جیسے اسلام کے صدرِ اول میں کہنا سُننا اشاعتِ دین کا وسیلہ تھا، اس کے بعد کہنے سُننے پر لکھنے پڑھنے کا اضافہ ہوا، بلکہ یہی ذریعہ غالب ہوا، محدثین سے لے کر قریب زمانہ تک علماء اسلام نے تبلیغِ دین کے لئے بلا مبالغہ لاکھوں کتابیں تصنیف کیں اور اُن سے کروڑوں لوگوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب برپا ہوا، اور اب قرطاس وقلم کی جگہ انفارمیشن کی ماڈرن ٹکنالوجی نے لے لی ہے، معمولی پیغامات سے لے کر بڑے بڑے افکار ونظریات تک کی تبلیغ بھی اسی پر آ گئی ہے۔

اشاعتِ دین ــــ جس کو دعوت وتبلیغ بھی کہا جاتا ہے ــــ کے تین پہلو ہیں ۱ داعی ۲ دعوت اور ۳ مدعو، یعنی دعوت، دعوت دینے والا اور جس کو دعوت دی جارہی ہے، دینِ اسلامی میں دعوت کے اِن تین کرداروں کے لئے علاحدہ علاحدہ مستقل احکام وآداب بیان کئے گئے ہیں اور اُن کا جاننا سمجھنا اور برتنا دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے لازم ہے، اس وقت ہمارے مدنظر یہ مضمون نہیں ہے بلکہ وسائلِ اشاعت ودعوت پر گفتگو مقصود ہے، اس لئے ان احکام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنے مقصد پر آتے ہیں۔

مدارسِ اسلامیہ کا حقیقی مقصد جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا حفاظتِ دین اور دعوتِ دین کے لئے رجالِ کار کی تیاری کرنا ہے، اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے الحمد للہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم فکر مدارس نے گذشتہ دوصدیوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اس کے اعتراف سے کوئی مخالف بھی چشم پوشی نہیں کرسکتا، ملک کے حکم رانوں سے لے کر عالمی قائدین تک سب ہی مدارس کی اس تحریک اور اس کے سماج پر گہرے اثرات کو لے کر انگشت بہ دنداں ہیں۔

اس حقیقت کے اعتراف اور اس کی کُھلے ذہن تعریف وتحسین کے ساتھ راقم سطور اپنی دعوتی زندگی کے طویل تجربے کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ ذمہ دارانِ مدارس نے گذشتہ کافی عرصے سے عصری تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں میں آنے والے لسانی انقلاب کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علماء کو تیار کرنے کی طرف مناسب توجہ نہیں دی، کروڑوں مسلمانوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب دیتے رہے مگر چند ہزار علماء کو انگریزی اور علاقائی زبان

میں دعوت کا سلیقہ سیکھنے کا پابند نہ کر سکے ،قوم تو اپنے رجحان کے مطابق معیاری اردو سے دور ہو کر اجنبی زبان کو اختیار کرتی چلی گئی اور ہم فصیح وبلیغ اردو کے مصنفین ومقررین تیار کرتے رہے ،نتیجہ یہ ہوا کہ عوام بالخصوص تعلیم یافتہ عوام کی اکثریت علماءِ اہلِ حق سے استفادہ نہ کر سکنے کی وجہ سے گم راہ اور ملحدانہ خیالات کے حامل نام نہاد اسلامی اسکالرز کی جانب مائل اور انہی کے خیالات سے متأثر ہو کر تباہ ہوتی چلی جارہی ہے۔

اس لئے میں ذمہ دارانِ مدارس ــــ بالخصوص ابتدائی جماعتوں کی تعلیم دینے والے مدارس کے ذمہ داران ــــ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابتدائی تعلیم ــــ نورانی قاعدہ سے لے کر عالمیت کے کم از کم سوم جماعت تک ــــ نصابِ تعلیم پر غور کرنے کی سخت ضرورت ہے؛ کیوں کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے تحتانی مرحلوں میں ایک تو وقت بہت ضائع ہو رہا ہے، دوسرے طلبہ میں وہ صلاحیت نہیں پیدا ہو رہی ہے جو دعوتِ دین کے تقاضوں کو مؤثر انداز میں پورا کر سکے اور سماج کے تمام طبقات کے قلوب کو مائل کر سکے؛ تعلیمی نفسیات تو ایک ہی ہوتی ہیں خواہ دینی ہو یا عصری ،مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عصری تعلیمی ادارے زمانے کے حالات ، بچوں کی نفسیات اور برآمد سہولیات کو ملحوظ رکھ کر نصاب ونظام میں مناسب ومفید تبدیلی کے لئے باقاعدہ غور کرتے رہتے اور تبدیلی لاتے رہتے ہیں مگر ہمارے ہاں ایک لمبے عرصے تک بھی اِن معقول امور کے حوالے سے کوئی خاص کام نہیں کیا جاتا اور ضروری معمولی تبدیلی کے لئے بھی گنجائش نہیں نکالی جاتی۔

یہ صحیح ہے کہ علومِ دنیویہ تغیر پذیر ہیں اور ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد متعین ہے اور مواد بھی طئے ہے، اور وہ مواد ناقابلِ تغیُّر وتبدُّل ہے ،مقصد رضائے الٰہی اور دارین کی سعادت ہے اور اس کا مواد علومِ عالیہ ــــ قرآن کریم ، حدیث شریف ، فقہ اسلامی اور ان کے اصول ــــ ہیں ۔اگر دیکھا جائے تو درسِ نظامی کے آٹھ سالوں میں سے ابتدائی چار سال ایسے ہیں کہ اُن کے مضامین علومِ آلیہ کہلاتے ہیں جو علومِ عالیہ سے استفادے کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے معاون علوم پر مشتمل ہوتے ہیں ، میں نہیں سمجھتا کہ اِن معاون علوم کو سہل الحصول بنانے اور ان میں ضرورتِ زمانہ کے مطابق تغیُّر وتبدُّل لانے میں کوئی حرج ہو سکتا ہے، حرج تو کیا ہوگا تجربہ یہ ہے کہ علمی صلاحیت مزید نکھر کر طالب علم مفید تر صلاحیت کا حامل بنتا ہے۔

ہمارے ہاں بچّے سب سے پہلے حفظ کرائے جاتے ہیں، اور حفظ کے مدارس میں طلبہ کو لینے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، نہ تکمیل حفظ کی کوئی مدّت مقرر ہے، نہ کوئی خاص نصاب ونظام ہے، طلبہ اپنے اعتبار سے پڑھتے رہتے ہیں، کئی کئی برس تو تجوید وناظرہ کے نام پر خراب کئے جاتے ہیں، پھر کئی سال حفظ میں لگ جاتے ہیں، اُسے حافظ بنانا ہے خواہ وہ عمر کے کسی حصّے میں پہونچ جائے اور چاہے آگے کچھ پڑھنے لکھنے کے لائق بھی نہ

رہے، اس سلسلے میں مدرسہ کے ذمہ داروں اور اساتذہ کو بالکل بھی خیال نہیں رہتا کہ آخر ۱۸۔۱۹ برس تک حفظ کرتا رہے تو آگے کی تعلیم کب حاصل کرے گا؟ اور اگر کرے تو کتنی عمر ہو جائے گی؟ اور اگر کچھ نہ پڑھ سکے تو نِرا حافظ دین کے کیا کام کا رہے گا اور دنیا کی ضروریات بھی کیسے پورے کر سکے گا؟ حفظ کی فضیلت بھی تو جب ہی ہے جب کہ اُسے قرآن کریم یاد ہو اور وہ اس کے حقوق کو ادا کرتا ہو، ان اُمور پر طالب علم تو خیر ناسمجھ ہے نہ سرپرست غور کرتے ہیں نہ اہلِ مدرسہ؛ مدرسہ والوں کو تو بس طلبہ کی تعداد بنائے رکھنا ہے، ماں باپ کو اپنی خواہش پوری کرنا ہے اور بچّے کو بڑوں کے ماتحت چلنا ہے، عمر کی بربادی کا کس کو غم! حد یہ ہے کہ بعض بچّے حفظ کرتے کرتے جوان ہو جاتے ہیں، مگر نہ اُن کو اردو لکھنا پڑنا آتا ہے نہ عقائد سے واقف ہوتے ہیں اور نہ قرآن ہی کچھ زیادہ پختہ ہوتا ہے، حالاں کہ درجوں میں دن بھر بے کار رہتے ہیں، ایسے بچے برائے نام حافظ ہو کر جب باہر نکلتے ہیں تو اپنے کو مجبوریوں میں جکڑا ہوا پاتے ہیں بعض بے دین ہو جاتے ہیں اور بعض دین ہی میں رہتے ہیں مگر عاجز و بے بس ہو کر لوگوں کے رحم و کرم پر جیتے ہیں۔

ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ مدارس حفظ میں بچوں کا داخلہ مناسب عمر میں لیا جائے اور تجوید و ناظرہ کے ساتھ بہ قدر ضرورت عصری علوم بھی پڑھائے جائیں، کیوں کہ بچہ قاعدے ناظرہ میں اپنا کام نصف گھنٹے سے ایک گھنٹے کے اندر مکمل کر لیتا ہے اور باقی وقت بے کار رہتا ہے؛ مثال کے طور پر ایک خاکہ پیش کرتا ہوں:

مثلاً بچے کو آٹھ سال کی عمر میں داخلہ دیا جائے تجوید و ناظرہ کے لئے تین سال مقرر کئے جائیں، بچے نے اس سے قبل کچھ نہ کچھ اسکول پڑھا ہوگا اور اگر نہیں پڑھا ہے تب بھی تجربہ کار اساتذہ کی مدد سے تین سالوں کے لئے پانچویں جماعت کی اہلیت تک کا عصری نصاب کسی بھی میڈیم میں مرتب کر لیا جائے، دِن بھر میں کُل آٹھ گھنٹیاں ہوں، دو قرآن مجید کی تجوید و قرأت کے لئے، ایک دینیات کے لئے اور پانچ عصری مضامین کے لئے ہوں، تین سال میں تجوید کے ساتھ ناظرہ قرآن کریم اچھی طرح پڑھنا آجائے گا، آخری پارہ حفظ بھی کرایا جا سکتا ہے، ساتھ ہی پانچویں جماعت تک عصری تعلیم کی اہلیت بھی پیدا ہو جائے گی، بچّے کا وقت بھی مصروف رہے گا جس سے ذوقِ علم بڑھتا اور ترقی کا ماحول بنتا رہے گا، اس کے برخلاف موجودہ نظام میں صبح سے شام تک قاعدہ ہاتھ میں لئے بیٹھے رہنے سے شوقِ علم میں ترقی کی فطری استعداد بھی گھٹتی رہتی ہے اور وقت بے کار ملنے سے بچے یا تو لغو و لایعنی کا ماحول بنا لیتے ہیں یا استاذ کی خشونت و سختی کو بھگت بھگت کر نڈر اور سخت جاں ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد چوتھے سال میں حفظ شروع کرایا جائے، اس کی تکمیل کے لئے بھی تین سال متعین کر لئے جائیں، مدرسے میں چھٹیاں کم سے کم رکھی جائیں اور رمضان کریم میں بھی ۲۰ یا ۲۵ دن تعلیم ہو تو انشاء اللہ سالانہ

دس پارے کا حفظ ہوسکتا ہے، اس میں بھی پہلے سال کے اختتام پر ہی بچّے کی استعداد اور حافظے کا تجزیہ اچھی طرح کرلیا جائے ، اگر بچہ کا حافظہ اور صحت حفظِ قرآن کا تحمل نہیں کرسکتے تو اسے شعبۂ عالمیت میں منتقل کردینا چاہیئے اس لئے کہ اس میں مضامین کے تنوّع کی وجہ سے کم زور درجے ہی میں سہی سال بہ سال ترقی کی امید کی جاسکتی ہے، کسی طرح عالم بننے کے بعد کم از کم معتبر داعی بن کر باوقار زندگی تو گذار سکتا ہے، برخلاف حفظ کی ضِد کے کہ اس صورت میں خدا جانے تکمیلِ حفظ تک عمر کے کتنے برس نکل جائیں، پھر جیّد اور پختہ حافظ بن سکے یا نہ بن سکے، حفاظ کی اکثریت کو آج نہ قرآن یاد ہے نہ ہی وہ تراویح میں سنانے کے قابل ہے، اس لئے بچوں سے خیر خواہی اور مستقبل کی بہتری کو ملحوظ رکھ کر بروقت فیصلہ کیا جانا چاہیئے، اس طرح اس کی زندگی ضائع ہونے بچ سکتی ہے۔

بہرحال حفظ کے لئے تین سال کی میعاد رکھی جائے ، اور یہ مدت اس لئے بھی کافی ہونی چاہیئے کہ اس نے قاعدہ ناظرہ گذشتہ تین سالوں میں اچھی طرح پڑھ لیا ہے۔ البتہ حفظ کے ساتھ تعلیم الاسلام، بہشتی ثمر جیسی کتاب کے لئے بھی وقت رکھا جائے ، تاکہ اردو میں مہارت بھی ہوتی رہے اور بلوغ سے قبل ضروریاتِ دین کا علم اچھی طرح ہوجائے ۔ بہت سے مدارس سے حفظ مکمل کرکے شعبۂ عالمیت میں آنے والے طلبہ کو دیکھا جاتا ہے کہ معمولی درجے کا اردو لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا لامحالہ داخلے سے معذرت کردینی پڑتی ہے، پھر وہ بچے یا تو اردو سیکھنے میں ایک سال اور خراب کرتے ہیں یا پھر مایوس ہو کر ترکِ تعلیم کر بیٹھتے ہیں ، یہ مدرسے والوں کی بچے کے ساتھ خِیانت نہیں تو اور کیا ہے؟

اب ساتویں سال عالمیت کا آغاز ہوگا، عالمیت کے ابتدائی تین سال کو تحتانیہ قرار دیا جائے، تحتانیہ میں کُل آٹھ گھنٹیاں ہوں چار دینی مضامین کے لئے اور چار عصری مضامین کے لئے ؛ بچہ پانچویں تک پڑھ چکا ہے، عالمیت کے پہلے سال میں چھٹی ساتویں، دوسرے سال میں آٹھویں نویں اور تیسرے سال میں دسویں جماعت کے اہم مضامین پڑھا کر دسویں کا باقاعدہ امتحان کرایا جائے ، یاد رہے کہ ایک صورت یہ ہے کہ دسویں کی سند دلادی جائے اور ایک ہے دسویں تک عصری علوم پڑھائے جائیں ، دوسری صورت مقصود ہو، پہلی صورت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور یہ نہ سوچا جائے کہ کیسے ہوگا، اس لئے کہ عصری مدارس کا نصاب بہت پھیلا ہوا ہے، ہم اسے تجربہ کار اساتذہ کی مدد سے سمیٹ سکتے ہیں، دوسرے ان مدارس میں چھٹیاں بہت ہیں، ہمارے ہاں اتنی نہیں ہیں، اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، ہر سال دو سمسٹر بنا کر بہ آسانی اتنا کورس نمٹایا جاسکتا ہے۔

بقیہ چار گھنٹیوں میں عربی زبان اور اس کے قواعد پڑھائے جائیں ،اس کے لئے عربی ادب میں تخصص

کئے ہوئے اساتذہ کو رکھا جائے اور عربی زبان بذریعہ عربی یا بہ ذریعہ اردو سکھائی جائے، بہ ذریعہ فارسی نہ سکھائی جائے ورنہ اس کے لئے پھر فارسی کی کتب رکھنی ہوں گی جس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔

فارسی زبان کو درسِ نظامی میں شامل رکھنے کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں، ایک تو یہی ہے کہ عربی گرائمر کی کتب فارسی میں لکھی گئی تھیں اور اس وقت وہی مفید مطلب کتابیں تھیں، فارسی سیکھنے پر ہی ان کتب سے استفادہ ممکن تھا، اب ایسی بات نہیں ہے، عربی ماہرینِ تعلیم نے خود عربی زبان میں بہت ہی مفید اور آسان کتابیں لکھ دی ہیں جو رائج ہیں، پھر اردو میں ہمارے علماء نے عربی صرف ونحو اور انشاء وادب پر خاصا کام کر دیا ہے، تو پھر محض فارسی میں لکھی کتبِ قواعد کی خاطر ایک زبان کو سیکھنے میں اچھا خاصا وقت صرف کرنا کارے دارد ہے، جب کہ دل چسپی اور مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کمال بھی حاصل نہیں ہوتا اور کم واقفیت کی وجہ سے اساتذہ نہ خود صحیح سمجھ رہے ہیں نہ طلبہ کو صحیح سمجھا رہے ہیں؛ رہ گیا کریما، پندنامہ وغیرہ کے ادبی واخلاقی فوائد کا مسئلہ تو اس کے لئے عربی میں متبادل رسائل مل سکتے ہیں۔

فارسی کا دوسرا مقصد اردو زبان کی تہذیب ہے، کیوں کہ اردو کے ادبی معیار میں فارسی کے سینکڑوں الفاظ کا استعمال ہے، اس لئے فارسی سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضروری ہے، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے فارسی بول چال کی ایک آدھ کتاب اردو کے نصاب میں جوڑی جاسکتی ہے، ویسے بھی اردو کا فارسی وعربی سے معمور ومخلوط معیار مدارسِ دینیہ ہی میں محدود ہو کر رہ گیا ہے ورنہ مدعو قوم ــــ جن کی ہدایت کے لئے علماء کو تیار کیا جاتا ہے ــــ وہ اب اردو میں ہر مشکل لفظ کے لئے انگریزی کا متبادل لفظ استعمال کرتی ہے اور مدرسے والی اردو سمجھتی بھی نہیں ہے اس لئے حفاظتِ دین کے کام میں تو اس کی اہمیت ہے مگر اشاعتِ دین میں اس معیار کی اردو کا فائدہ کم ہو گیا ہے (یہ بالخصوص جنوبی ریاستوں کی صورت حال ہے اور میرے اس مضمون کے مخاطب بھی اصلاً انہی علاقوں کے ذمہ دارانِ مدارس ہیں، شمالی ریاستوں میں اردو کی صورتِ حال ابھی تک اس سے مختلف ہو سکتی ہے مگر آگے چل کر تو سوچنا پڑے گا)

اب عالمیت کے اگلے تین سال وسطانیہ کے ہوں گے جن میں منطق وفلسفہ، ترجمہ وتفسیر اور اصول کے مضامین غالب رکھے جائیں، اور آخری تین سال علومِ عالیہ کے لئے مختص ہوں گے، اِن چھ سالوں کی کتابیں مرکزی مدارس بالخصوص دارالعلوم دیوبند میں رائج درس نظامی پر مشتمل ہونی چاہئیں، تاکہ طالب علم کسی بھی بڑے ادارے میں داخلہ حاصل کر سکے اور علومِ شرعیہ میں مہارت وکمال حاصل کر سکے۔

اس نصاب کی ترتیب اور مُدت اس طرح ہوگی:

قاعدہ ناظرہ معہ ریاستی نصاب کی پانچویں جماعت ۳ سال + حفظ قرآن کریم معہ دینیات واردو ۳ سال + شعبۂ عالمیت تحتانیہ عربی صرف ونحو اور زبان دانی کے ساتھ دسویں جماعت کی تکمیل ۳ سال + عالمیت کے وسطانی وفوقانی مراحل افتاء تک ٦ سال۔کُل وقفۂ تعلیم ۱۵ / برس اور کُل موادِ تعلیم تجوید/حفظ/عالمیت/افتاء اور دسویں جماعت تک عصری تعلیم، داخلہ ۸/سال کی عمر میں ہوا تھا تو ۸ + ۱۵ = ۲۳/سال کی عمر تک اس قدر جامع نصاب تعلیم کا حامل ہوجائے گا، یہی عمر نکاح کرنے اور خدمات کی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کے لئے بھی بالکل موزوں ومناسب ہوگی، ویسے بھی طلبہ دورۂ حدیث شریف کی تکمیل تک چوبیس پچیس سال کے ہو ہی جارہے ہیں مگر مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اگر نظام بنایا جائے تو مناسب عمر تک جامع ومانع نصاب سے فراغت بھی ہوجائے گی اور صلاحیت میں انشاء اللہ کافی اضافہ ہوسکے گا؛ پھر جو طلبہ حفظ نہیں کرسکیں گے وہ جلدی فارغ ہوکر دینی یا عصری تخصصات سے بھی استفادہ کرسکیں گے۔

مدارسِ دینیہ سے فارغ ہونے والوں میں اب بھی صرف دس تا پندرہ فی صد ایسے علماء ہوتے ہیں جو حفاظتِ دین یعنی کتاب وسنت کی تعلیم وتدریس اور تحقیق وتخریجِ احکام کا کام انجام دے سکتے ہیں، باقی سب دُعاۃِ دین کی حیثیت سے میدانِ عمل میں آتے ہیں، مذکورہ بالا نصاب کے تحت جو عصری علوم ہیں اُن میں انگریزی ـــــ جواب کسی قوم کی زبان نہیں رہی عالمی زبان کا درجہ اختیار کرگئی ہے ـــــ اور علاقائی زبانوں پر خصوصی توجہ رکھی جائے اور ان زبانوں میں اظہارِ خیال کی انجمنوں میں تمرین کرائی جاتی رہے تو دعوت کے فریضے کو موجودہ علماء سے کہیں اچھی طرح اور کہیں زیادہ طبقوں تک پہونچانے میں مدد مل سکتی ہے، آج کا المیہ علماء کی قلت نہیں ہے عوامی زبان اور مزاج سے نامانوسی اور دوری اصل المیہ ہے، دیکھئے قرآن مجید میں کیا فرمایا گیا ہے: ''اور ہم نے جس نبی کو بھی بھیجا ہے اس کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں سے صاف صاف بتاسکے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ سے ہٹادیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے[1] اور اللہ غالب حکمت والا ہے''۔ (سورۂ ابراھیم: ۴)

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر نے فرمایا ہے ''یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بڑا فضل ہے کہ اس نے ان کی ہدایت کے لئے انہی میں سے نبیوں کو مبعوث فرمایا اور انہی کی زبان میں مبعوث فرمایا تاکہ وہ بندے اپنے نبیوں سے ان کے اس پیغام کو اچھی طرح سمجھ سکیں جو وہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں

---

[1] تفسیر عثمانی میں ہے: یعنی تبیین وہدایت کے سامان مکمل کردیئے، پھر جس نے ان سامانوں سے منتفع ہونا چاہا اس کی دستگیری فرماکر راہ پر لگادیتا ہے، جس نے روگردانی کی اسے گمراہی میں چھوڑے رکھا وہ زبردست اور غالب ہے۔

۔۔۔۔اس تبیینِ رسالت اوراس کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت کی راہ سے ہٹا دیتا ہےاور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے(۲/۶۵۱)

اسی طرح حدیث میں بھی ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اس قوم کی زبان ہی میں مبعوث فرمایا‘‘(مسند احمد)

آیت اور حدیث میں نبیوں کو ان کی قوم کی زبان میں بھیجنے کا اس اہتمام کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ تفہیم دعوت کے لئے داعی اور مدعو کی زبان میں یکسانیت ضروری ہے، ورنہ قوم کے نہ سمجھ سکنے کی ذمہ داری داعی پر ہی ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے ہر علاقے میں رائج زبانوں میں دین کی محنت کی ہے اس میں کتابیں لکھی ہیں، تراجم قرآن وحدیث کئے ہیں۔

حضرت کشمیریؒ کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ شروع میں صرف عربی اور فارسی زبان کی ترغیب دیتے تھے پھر جب حضرت تھانویؒ کا اردو ترجمہ قرآن دیکھا تو طلبہ کو اردو میں بھی اظہارِ خیال کی ترغیب دینے لگے۔ اسی طرح جب عوام کا رجحان انگریزی تعلیم کی طرف بڑھنے لگا تو اگرچہ آج کے مقابلے میں یہ رجحان بہت کم تھا مگر مستقبل کا اندازہ کرکے آپ نے دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ انگریزی کے قیام کی سفارش بھی فرمائی تھی۔

یہی بات میں نے گزشتہ شمارے میں اس طرح ذکر کی تھی:

رہبرانِ قوم اور قوم کے درمیان دین میں، دیانت میں، علم میں، عمل میں اخلاق میں تفاوُت تو معقول وُمسلَّم ہے مگر کیا اُن کے درمیان زبان وبیان میں بھی اجنبیت ومغایرت مُسلَّم ومعقول ہوسکتی ہے؟ اور زبانِ یارِمن تُرکی اور من تُرکی نمی دانم کا عذر قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اس لئے کہ جو راہبر قوم کی زبان نہیں جانتا وہ قوم کی رہبری کیا کرسکتا ہے؟ یہ مسئلہ علماء اور دُعاۃ کو تیار کرنے والوں یعنی ذمہ دارانِ مدارس کے غور کرنے کا تھا مگر کیا ہمارے مدارس میں پڑھنے والے طلبہ اور پڑھانے والے علماء نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے بروقت غور کیا؟ یہ صحیح ہے کہ مدارسِ دینیہ کا یہ نظام جو گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہمارے مُلک میں رائج ہے اُس کی ابتداء شمالی ہندوستان سے ہوئی ہے، جہاں کے بہت وسیع وعریض علاقے میں پہلے فارسی پھر اردو زبان عام بول چال کی اور تعلیم وتعلُّم کی زبان رہی ہے، اُس وقت مسلمانوں کی جو چھوٹی بڑی ریاستیں موجود تھیں اُن میں بھی فارسی اور اردو کا اچھا خاصا چلن تھا، علماء وعوام دونوں کی زبان ایک ہی تھی، نوکریوں اور ملازمتوں کا تعلق بھی اسی میں مہارت سے تھا، لوگ ذوق وشوق سے سیکھتے بھی تھے، اس لئے قوم اور راہ برانِ قوم کے درمیان رابطہ سہل تھا، پیغام رسانی بہت آسان تھی، نہایت فصیح وبلیغ اردو زبان میں کتابیں لکھی جاتی تھیں تو پڑھی بھی جاتی تھیں، مقفّیٰ

و مسجّع تقریریں کی جاتی تھیں تو سُنی بھی جاتی تھیں، مشاعرے ہوتے تھے تو شعراء کو ایک ایک شعر کی تفہیم نہیں کرنی پڑتی تھی، ادبی محفلوں میں زبان وادب کی دادیں لی اور دی جاتی تھیں، لیکن جب مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا اور فرنگیوں نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی تو رفتہ رفتہ یہ اردو زبان محدود طبقے میں سمٹ کر رہ گئی، کم از کم بڑے شہروں اور قصبوں میں بالخصوص جنوبی ہندوستان کے علاقوں میں اردو زبان یوں عام بول چال میں موجود ہے مگر سیکھنے سکھانے اور پیغام رسانی کے لئے اس کا استعمال تقریباً ختم ہو چکا ہے، اس وقت جو طبقہ عرف میں تعلیم یافتہ کہلاتا ہے یعنی عصری علوم پڑھا ہوا ہے وہ تو اردو سے بالکل ہی محروم ہے، جو نوجوان اَن پڑھ ہیں اُن کو بھی اور جو پڑھے لکھے ہیں اُن کو بھی خالص اردو پلّے ہی نہیں پڑتی، اس لئے کہ یہ لوگ جس قدر اردو بول سُن لیتے ہیں اس میں بھی بیس تا تیس فی صد انگریزی ملی ہوئی ہوتی ہے، اور اُن سے چھوٹے بچّے تو اب مولویوں تک کے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں یا پھر علاقائی زبانوں کی میڈیم میں!

ایسے حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خالص اردو زبان کے ماہر وادیب علماء کرام اور قوم کے لئے قابلِ فہم زبان سے محروم خطیب وداعی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے دینی تحفظ کا فریضہ کیسے انجام دے سکتے ہیں؟ وہ دین اور علمِ دین کا تحفظ تو یقیناً کر سکتے ہیں مگر اپنے سینوں اور کتابوں کے سفینوں میں کر سکتے ہیں، درس گاہوں میں کر سکتے ہیں، مگر محتاجوں کے دِلوں اور زندگیوں میں اس کا تحفظ نہیں کر سکتے، جدید تعلیم یافتہ عوام کی طلب علم اور دین کی پیاس بُجھا نہیں سکتے! وہ کتابیں لکھ سکتے ہیں مگر پڑھوا نہیں سکتے، تقریریں کر سکتے ہیں مگر سمجھا نہیں سکتے، اُن کے دِلوں میں جو شکوک وشبہات ہیں اُن کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ دور کر سکتے ہیں؛ ہاں اس طبقے کے بگاڑ پر افسوس اور اُن کی گم راہیوں کا ماتم کر سکتے ہیں۔

بہر حال! جیسا کہ بالکل شروع میں عرض کر چکا ہوں مدارس میں عصری علوم کا کچھ حصہ لینے اور انگریزی وعلاقائی زبانوں پر محنت کرانے کی بات ان علوم یا ان کے حاملین سے مرعوبیت کی بناء پر نہیں کر رہا ہوں، اسی ضرورتِ دعوت کی بنیاد پر کر رہا ہوں، میرے خیال میں انگریزی اور علاقائی زبان میں اظہار کی قابلیت سے تو عالم کی دعوت کا میدان وسیع اور انداز مؤثر ہوگا اور سائنس سے واقفیت قرآن کریم کے سمجھنے اور سمجھانے میں بہت مددگار ہوگی، کیوں کہ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود اور وحدت کے دلائل پر مشتمل ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخاطبین کی توجہ زیادہ تر ماحولیات کی طرف متوجہ فرمائی ہے؛ ارض وسماء، شمس وقمر، نجوم وجبال، جنات وعیون، غرضے کہ حیوانات، نباتات، جمادات اور خود شخصِ انسانی میں غور وفکر کی دعوت قرآن کریم کے سی پاروں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، ہم لوگ تفسیر کے نام پر ان کا ترجمہ ہی کر لینے پر اکتفاء کرتے ہیں،

لیکن اگر ذرا ان کی تفصیل میں جا کر دیکھیں تو اُن میں ایسی محیّرُ العقول اور دلچسپ دلائل نظر آتے ہیں جو آدمی کو توحید خالص اور معرفت کامل کے مرتبے تک پہونچا دیتے ہیں، جن علماء کو اس پر دسترس حاصل ہے آج بھی ان کی تقریریں غور سے سنی جاتی ہیں اور اُن کے دروس میں طالب علموں کو دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ خدا تک پہونچنے کے لئے ماحولیات ہی ''ہر ورقہ دفتریست از معرفتِ کردگار'' کا مصداق ہے، اس لئے تھوڑی بہت سائنس اور سماجی علوم سے واقفیت کی بھی عالم دین کو سخت ضرورت ہے، پہلے کے علماء ان علوم سے بے خبر بالکل نہیں تھے، چناں چہ قدیم علماء کی تفسیروں اور شروحات میں ہم اس کا تجربہ کر سکتے ہیں، جدید تعلیم یافتہ طبقہ چوں کہ انہی علوم کا حامل ہے اس لئے ان کو اس کے ذریعہ بہت آسانی سے دین کے قریب لایا جا سکتا ہے اور اَن پڑھ و بے علم طبقے کے لئے بھی سب سے آسان ذریعۂ تفہیم یہی چیزیں ہیں، تب ہی اللہ تعالیٰ نے جا بہ جا قرآن کریم میں انہی چیزوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

ایک اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ بیان کردہ نظام و نصاب کم سِن طلبہ کو لے کر ہی کامیاب ہوسکتا ہے جب کہ بہت سے طلبہ کو بڑی عمر میں توفیق ہوتی ہے یا مختلف عمر کے طلبہ آتے ہیں تو انہیں کیا کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہیں محروم بالکل نہ کیا جانا چاہیئے، تعلیم کا نظام تو اسی طرح بنایا جائے اور آئندہ سالوں میں اسی کی پابندی کی جائے لیکن مدرسے میں بڑی عمر کے طلبہ کے لئے بھی علاحدہ نظام رہے یا اُن کے لئے فاصلاتی نصاب اوپن یونی ورسٹی کی طرز پر رکھ لیا جائے، بہر حال اگر مسئلے کو سنجیدہ لیا جائے تو ہر مشکل کا حل نکل سکتا ہے اور اہداف بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

آخر میں صاف عرض کر دیتا ہوں کہ نصاب و نظام کے سلسلے میں میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ بہ طور مثال اور بہ طور دعوتِ فکر کے لکھا ہے، اگر اصحابِ علم و فضل میری ان معروضات سے اتفاق کریں تو وہ زیادہ صحیح طریقے پر اس موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں بلکہ زیادہ صحیح لائحہ عمل دے سکتے ہیں، میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنے چند لائق و صالح تلامذہ کے ساتھ اپنے مدرسے میں دو تین سال قبل ہی سے عملی تجربہ شروع کر دیا ہے، جو مشکل ہونے کے باوجود کامیاب لگ رہا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں بعض مدارس ایسی کوششیں کر رہے ہیں، مگر میں تفصیلات سے واقف نہیں ہوں، میری فکر کا حاصل صرف یہ ہے:

- مدارس کا مقصد دین کی حفاظت اور اشاعت کے اہل فضلاء کو تیار کرنا ہے۔
- حفاظت کے کام کے لئے جن وسائل استعداد و قابلیت کی ضرورت ہے اُن کی تعیین کرنا اور اُنہیں سہل الحصول بنایا جانا چاہیئے۔

● اشاعتِ دین کے لئے فضلاء مدارس کو زمانے کی ضرورت کے مطابق وسائل دعوت سے آراستہ کرنے کے مباح اسباب اختیار کئے جانے چاہئیں۔

● علماء کرام کے لئے کامیاب داعی بننے کے واسطے بہ قدرِ ضرورت علومِ عصریہ سے واقف ہونا بہت ضروری ہے، اس کا انتظام ہونا چاہیئے۔

● انگریزی اور علاقائی زبانوں میں اظہارِ خیال کی صلاحیت بھی مسلمانوں کے عقیدہ وعمل کے تحفظ کے لئے علماء میں لازمی ہے، اس لئے اس پر بھی سنجیدہ محنت ہونی چاہیئے۔

● اس سلسلے میں اربابِ مدارس نے اب کوشش نہیں کی تو اُمت میں تیزی سے داخل ہوتے ارتداد والحاد کے سیلاب کو روکنے کی پھر کوئی صورت نہ ہوگی، اور اہلِ مدارس عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔

وما علینا الا البلاغ وصلی اللہ علی سیدنا محمد

(بقیہ صفحہ ۲۱ سے)

بات واضح اور دوٹوک، نہ مختصر نہ فضول، انداز ایسا کہ گویا لڑی سے موتی جھڑ رہے ہیں، درمیانہ قد، نہ ناٹے کہ نگاہ میں نہ جچے، نہ لمبا کہ ناگوار لگیں، دو شاخوں کے درمیان ایسی شاخ کی طرح ہیں جو سب سے زیادہ تازہ اور خوش منظر ہے، رفقاء آپ کے گرد حلقہ بنائے، کچھ فرمائیں تو توجہ سے سنتے ہیں، کوئی حکم دیں تو لپک کر بجالاتے ہیں، مطاع ومکرم، نہ ترش رو، نہ لغوگو۔ ''له رفقاء يحفون به، إن قال انصتوا القوله، وإن أمر تبادروا إلى أمره، محفود محشود، لا عابس ولا مفند'' (دیکھئے: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، لابن عبد البر: ۴/۱۹۵۹، دار الجیل، بیروت)۔

ابو معبدؓ نے کہا: اللہ کی قسم! یہ وہی تو عظیم ہستی ہیں جن کی تلاش میں لوگ سرگرداں ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کی زیارت کروں، مرے لئے اگر ممکن ہوا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی کوشش کروں گا۔

(جاری۔۔۔۔۔)

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

حضرت ام معبد بنت خالد رضی اللہ عنہا

نام ونسب: آپ کا نام عاتکہ تھا اور کنیت ام سعید تھی، والد کا نام خالد بن خلیف تھا جو بنی خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ جلیل القدر صحابی رسول ﷺ حبیش بن خالد الخزاعی الکعبی رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ اور بہن ہوتی ہیں، جنہوں نے فتح مکہ میں شرکت کی، یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ہمراہ تھے، اور فتح مکہ کے موقع پر انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

شہرت و پہچان

معزز خاتون سیدہ ام معبد الخزاعیہ مہاجرین میں بھی شامل ہیں، زمانۂ جاہلیت میں کوئی مشہور ومعروف خاتون نہ تھیں، بس ایک عام دیہاتی خاتون تھیں، جن کی شہرت ان کے خیمہ، اہل خانہ اور خاندان تک محدود تھی، لیکن جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ کے سفر ہجرت پر جاتے ہوئے ان کے مہمان بنے تو اس خاتون پارسا کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

ام معبدؓ کے گھر پڑاؤ

یہ سخت جان مشہور خاتون اپنے خیمے کے صحن میں بیٹھی ہوتیں، جو مسافر وہاں سے گذرتے ان کو کھانا کھلاتیں اور پانی پلاتیں، حضرت نبی کریم ﷺ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے غلام فہیرہ اور رہبر عبداللہ اریقط کا ان کے خیمہ کے پاس سے گذر ہوا، انہوں نے ام معبدؓ سے پوچھا کہ ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میرے پاس اگر کوئی چیز ہوتی تو میں آپ لوگوں کی ضیافت ضرور کرتی، آپ ﷺ نے خیمے کے ایک کونے میں بکری کھڑی دیکھی، تو پوچھا: ام معبدؓ! یہ بکری کیسی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ بکری تھکاوٹ اور کمزوری کی وجہ سے ریوڑ کے ساتھ نہ جاسکی، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ دودھ دیتی ہے؟ اس نے

* رفیق تصنیف دار الدعوۃ والارشاد، حیدرآباد، واستاذ حدیث دار العلوم دیودرگ

کہا: یہ تو بہت لاغر اور کمزور ہے، یہ کیا دودھ دے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر اجازت ہو تو میں اس کا دودھ دوہ لوں؟ اس نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! اگر یہ دودھ دے سکتی ہے تو اس کا دودھ دوہ لیجئے؟" بأبی انت و أمی، إن رأیت بھا حلبا فاحلبھا" (دیکھئے: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، لابن عبد البر: ۱۹۵۹/۴، دار الجیل، بیروت)۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بکری کے تھنوں کو اپنا ہاتھ لگایا، بسم اللہ کہا اور دعا کی تو اس کے تھنوں سے دودھ کے قطرے گرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برتن منگوایا اس میں دودھ دوھا، دودھ سے برتن بھر گیا، ام معبد رضی اللہ عنہا کو دودھ دیا انہوں نے خوب سیر ہو کر پیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور آپ کے ساتھیوں نے خوب سیراب ہو کر دودھ پیا پھر دوسری مرتبہ اسی طرح دودھ دوہا، جس سے برتن بھر گیا، یہ دودھ ام معبد رضی اللہ عنہا کو دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ کی طرف آگے بڑھ گئے، تھوڑی دیر بعد ان کے خاوند ابو معبد رضی اللہ عنہ مریل بکریوں کے ریوڑ کو ہانکتے ہوئے آگئے، یہ بکریاں کمزوری کی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں، جب ابو معبد رضی اللہ عنہ نے دودھ دیکھا تو انہیں بڑا تعجب ہوا، انہوں نے پوچھا: کہ یہ دودھ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ بکری بھوکی تھی، چراگاہ میں چرنے بھی نہیں گئی تھی اور گھر میں بھی دودھ نہیں تھا، یہ ماجرا کیا ہے؟ ام معبد رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کی قسم! آج یہاں سے ایک بابرکت ہستی کا گذر ہوا، اس نے یہ یہ باتیں کیں اور اس کا حال اس طرح کا تھا۔ (حوالہ سابق)

تاریخ میں یہ بھی تذکرہ ہے وہ بکری جس کی تھن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ پھیرے تھے، وہ عام الرمادتھی حیات رہی، ہم صبح وشام اس سے دودھ دوہتے رہتے، روئے زمین پر دودھ نہ تھوڑا ہوتا نہ زیادہ "فکنا نحلبھا صبوحا وغبوقا، وما فی الأرض لبن قلیل ولا کثیر"۔

(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ام معبد الخزاعیۃ: ۴۷۶/۸، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ام معبد رضی اللہ عنہا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ:

یہ سن کر شوہر نے کہا: ام معبد! مجھے ذرا تفصیلی حلیہ بتائیں۔

حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہایت بہترین وصف اور حلیہ بیان کیا جو تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے:

"چمکتا رنگ، تابناک چہرہ، خوبصورت ساخت، نہ توندلے پن کا عیب نہ گنجے پن کی خامی، جمالِ جہاں تاب کے ساتھ ڈھلا ہوا پیکر، سرمگیں آنکھیں، لمبی پلکیں، بھاری آواز، لمبی گردن، باریک اور باہم ملے ہوئے ابرو، چمکدار کالے بال، خاموش ہوں تو باوقار، گفتگو کریں تو پرکشش، دور سے دیکھنے میں سب سے تابناک و پُر جمال، قریب سے سب سے خوبصورت، گفتگو میں چاشنی، ۔۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

گوشۂ سیرت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جسمانی خصوصیات

مفتی محمد عارف باللہ القاسمی*

اللہ نے اپنے محبوب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام انسانوں سے مختلف بہت سی خصوصیات وکمالات سے نوازا تھا، ان ہی میں سے چند وہ خصوصیتیں بھی ہیں جو اللہ نے آپ کے جسم اطہر میں ودیعت فرمائی تھی۔

جن وملائک کو دیکھنے اوران سے بات کرنے کی قوت:

عام انسانوں کے برخلاف اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ قوت عطا کررکھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن وشیاطین کو دیکھنےاوران سے بات کرنے اسی طرح ملائک کودیکھنےاوران سے ہم کلام ہونے پر قادر تھے، اسی لئے آپ نے جنوں کوان کے پاس پہونچ کر دعوت دی اوران کواللہ کی طرف بلایا، اسی طرح حضرت جبریل کوآپ نے ان کی اصلی شکل میں دیکھا اوران گنت مرتبہ ان سے ہم کلام ہوئے اوران کوقرآن کریم سنایا، اوران کی رفاقت میں سفر معراج پرروانہ ہوئے۔

اپنے پیچھے دیکھنے کی قدرت:

عام انسان صرف اپنی نگاہوں کے سامنے کی چیزوں کو دیکھنے پر قادر ہے، اس کی پیٹھ کے پیچھے موجود چیزوں اورافراد کوسامنے نظر رکھتے ہوئے دیکھنے کی اس میں قوت نہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کواللہ نے یہ خوبی دے رکھی تھی، چناں چہ صحابی رسول حضرت سہل بن سعدؓ فرماتے ہیں:

’’ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی اور پھر ہماری جانب متوجہ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے فلاں تم اچھی طرح نماز کیوں نہیں پڑھتے ہو؟ نماز پڑھنے والا نماز پڑھتے وقت یہ کیوں غور نہیں کرتا کہ وہ کس طرح نماز ادا کررہا ہے؟ حالانکہ وہ اپنے فائدہ کے لئے نماز پڑھتا ہے، بخدا میں اپنے پیچھے ویسا ہی دیکھتا ہوں جیسا کہ اپنے آگے دیکھتا ہوں‘‘۔(مسلم) علامہ ابن حجر عسقلانیؒ اور دیگر محدثین کے بقول یہاں دیکھنے سے مراد قلبی رویت، الہام یا وحی نہیں ہے، بلکہ ’’رویت بصری‘‘ (نگاہ سے دیکھنا) مراد ہے۔

---

* استاذ حدیث جامعہ عائشہ نسواں حیدرآباد

عام انسانوں سے زیادہ قوت سماع:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ نے عام انسانوں سے زیادہ قوت سماعت عطا فرما رکھی تھی، اسی لئے بہت سے وہ باتیں جن کو عام انسان نہیں سن سکتے تھے آپ میں ان کے سننے کی صلاحیت موجود تھی، اسی لئے آپ نے خود ہی اپنے بارے میں ارشاد فرمایا: ''میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ باتیں سنتا ہوں جو تم نہیں سن سکتے، آسمان چرچراتا ہے اور اس کا چرچرانا حق ہے اس میں چار انگلی کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں ہے کہ وہاں کوئی فرشتہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیشانی رکھ کر سجدہ ریز نہ ہو۔ اللہ کی قسم اگر تم لوگ وہ کچھ جاننے لگو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنستے اور زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت نہ حاصل کرتے جنگلوں کی طرف نکل جاتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے''۔ (ترمذی)

آنکھیں سوتی ہیں پر دل بیدار رہتا ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ نے یہ خصوصیت بھی دی تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سوتے تھے تو آپ کی نگاہ ہی سوتی تھی، لیکن آپ کا دل بیدار رہتا تھا، گویا آپ کا سونا بھی عام انسانوں سے مختلف تھا، اسی لئے عام انسانوں کا وضو سونے سے ٹوٹ جاتا ہے، لیکن آپ کا وضو سونے سے نہیں ٹوٹتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی اس خداداد کمال کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: تَنَامُ عَيْنِي، وَلَا يَنَامُ قَلْبِي (مسند احمد: ۲۴۱۷۷) ''میری آنکھ سوتی ہے میرا دل نہیں سوتا''

مشک سے زیادہ معطر پسینہ:

جسم سے پسینہ ہر انسان کو نکلتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی نکلا کرتا تھا، لیکن عام انسانوں کے برخلاف آپ کا پسینہ مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہوتا تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آرام فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پسینہ آیا، میری والدہ محترمہ ایک شیشی لائیں اور آپ کا مبارک پسینہ پونچھ کر اس شیشی میں ڈالنے لگیں تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیدار ہو گئے اور آپ نے فرمایا: اے ام سلیم رضی اللہ عنہا تم یہ کیا کر رہی ہو؟ اُم سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہنے لگیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پسینہ مبارک ہے جس کو ہم اپنی خوشبو میں ڈالیں گے اور تمام خوشبوؤں سے بڑھ کر خوشبو محسوس کریں گے''۔ (مسلم)

حضرت انس ہی کی ایک روایت میں ہے: وَلَا شَمِمْتُ مِسْكَةً وَلَا عَنْبَرَةً أَطْيَبَ مِنْ رَائِحَةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ (مسلم: ۲۳۳۰)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بدن میں جو خوشبو تھی وہ مشک وعنبر میں بھی نہیں تھی''

آپ کے لعاب، بال اور وضو میں استعمال کئے ہوئے پانی سے برکت کا حصول:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو اللہ نے سراپا خیر و برکت کا پیکر بنا رکھا تھا، اسی لئے آپ کے لعاب، آپ کے موئے مبارک اور آپ کے وضو میں استعمال کئے ہوئے پانی سے صحابہ برکت حاصل کیا کرتے تھے اور، اس کی برکتیں انہیں حاصل ہوتی تھیں۔ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم، جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھوکتے تو وہ جس کسی کے ہاتھ پڑتا، وہ اس کو اپنے چہرے اور بدن پر مل لیتا اور جب وہ کسی بات کے کرنے کا حکم دیتے تو ان کے اصحاب بہت جلد اس حکم کی تعمیل کرتے، اور جب بھی وضو کرتے، تو ان کے غسالہ وضو کے لئے صحابہ میں لڑنے کی کیفیت ہو جاتی''۔ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں مروی ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تھے تو مدینہ منورہ کے خادم اپنے برتنوں میں پانی لے کر آتے پھر جو برتن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس برتن میں اپنا ہاتھ مبارک ڈبو دیتے اور اکثر اوقات سخت سردی کے موسم میں بھی یہ اتفاقات پیش آجاتے تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں اپنا ہاتھ مبارک ڈبو دیتے''۔ (مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے اور میں ایسا سخت بیمار تھا کہ کوئی بات سمجھ نہ سکتا تھا، آپ نے وضو فرمایا اور اپنے وضو کا پانی میرے اوپر ڈالا، تو میں ہوش میں آگیا''۔ (بخاری)

حضرت عثمان بن عبداللہ بن موہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارک سے حصول برکت کے معمول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مجھے میرے گھر والوں نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پیالہ دے کر بھیجا، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارک تھے، جب کسی کو نظر لگ جاتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو وہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس برتن بھیج دیتا، عثمان کا بیان ہے کہ میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو مجھے چند سرخ بال نظر آئے''۔ (بخاری)

شق صدر کے ذریعہ قلب مبارک کی صفائی

بچپن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک کو چاک کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک میں سے مادہ معصیت اور حظ شیطان کو نکال دیا گیا، اور پھر اس کو ٹھنڈے پانی سے دھویا گیا، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلب مبارک معصیتوں کے تمام نشانات سے پاک ہو جائے اور آپ معصیت سے معصوم رہیں۔

دس سال کی عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک کو چاک کر کے آپ کے قلب اطہر کو مادۂ لہو ولعب سے پاک کیا گیا، تاکہ لہو ولعب کی طرف میلان ذکر خدا سے غفلت کا ذریعہ نہ بنے۔

بعثت کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ کو چاک کرکے آپ کے قلب صافی کو اسرار وحی اور علوم الٰہیہ کے تحمل کے قابل بنایا گیا۔ اور پھر چوتھی بار سفر معراج کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک کو چاک کرکے آپ کے قلب اطہر کو عالمِ ملکوت کی سیر، تجلیات الٰہیہ اور آیاتِ ربانیہ کے مشاہدے اور رب ذوالجلال کی مناجات کے تحمل کے قابل بنایا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خصوصی شان ہے کہ متعدد بار الگ الگ حکمتوں کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک کو چاک کرکے آپ کے قلب مطہر ومنور کو طہارت ونورانیت کی کمال اور انتہاء تک پہونچایا گیا۔ (سیرۃ المصطفی: ۱/ ۸۴)

اور پھر قلب اطہر کے بالکل بالمقابل دونوں شانوں کے درمیان مہر لگادی گئی تاکہ قلب شیطان کے وسوسوں اور بیرونی حملوں سے محفوظ ہوجائے، اس لئے کہ شیطان اسی جگہ سے وسوسے ڈالتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ کسی نے اللہ جل شانہ سے درخواست کی کہ اے رب العالمین مجھ کو شیطان کے وسوسہ کا راستہ دکھلا کہ وہ کس راستہ سے آکر آدمی کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے، تو من جانب اللہ دونوں شانوں کی درمیانی جگہ جو بالکل دل کے بالمقابل بائیں جانب ہے، وہ دکھلائی گئی کہ شیطان اس راستہ سے آتا ہے، اور جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ (روض الانف: ۲/ ۱۱۵، ط: داراحیاء التراث)

جنتی چالیس مردوں کی قوت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتیازی خصوصیتوں میں سے ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ آپ کو چالیس جنتی مردوں کی قوت اللہ نے عطا کی تھی۔ چناں ایک روایت میں آپ کا یہ ارشاد مذکور ہے: أُعْطِيتُ قُوَّةَ أَرْبَعِينَ فِي الْبَطْشِ وَالنِّكَاحِ (المعجم الاوسط: ۵۶۷) ''مجھے نکاح اور گرفت کے سلسلہ میں چالیس (جنتی) مردوں کی قوت دی گئی ہے'' اور جنتی مردوں کی قوت کے بارے میں ایک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک جنتی مرد کو کھانے پینے صحبت اور شہوت کے سلسلہ میں (دنیا کے) سو مردوں کے جیسی طاقت ہوگی'' (سنن دارمی)

ان دونوں حدیثوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طاقت وقوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے چار ہزار مردوں کے برابر طاقت وقوت رکھتے تھے، یہ بھی آپ کا امتیاز تھا، اس کے باوجود آپ عفت وعصمت کے اس کمال پر فائز تھے کہ آپ نے امت کی تعلیم اور وحی الٰہی کی تبلیغ کی خاطر بقدر ضرورت صرف گیارہ عورتوں سے شادی کرنے پر اکتفاء کیا، گویا آپ کے تعدد ازدواج کے پیچھے کہیں بھی نفسانی جذبات کارفرما نہیں تھے، ورنہ تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہوتی، بلکہ اللہ نے تعلیم وتبلیغ کے مقصد سے گیارہ تک کی خصوصی

اجازت آپ کو دی اور اسی مقصد سے آپ نے اتنی عورتوں سے نکاح فرمایا۔

مرض کی شدت

آزمائش بقدر قربت ہوا کرتی ہے، انبیاء کرام اللہ کے سب سے زیادہ مقرب ہوتے ہیں، اسی لئے انبیاء کو اتنی ہی سخت آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش سے دوچار انبیاء ہوتے ہیں پھر وہ جوان سے قریب ہو اور پھر وہ جوان سے قریب ہو'' (سنن کبریٰ للنسائی)

اس لئے کہ آزمائش نعمت کے مقابلہ میں ہوتی ہے، تو مقربین پر رب کی نعمتیں جتنی زیادہ ہوتی ہیں ان کو ان کے مقابل آزمائشوں سے اتنا ہی دوچار ہو کر صبر وشکر کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، اور ان کے یقین وتوکل کے سامنے تکلیف کی شدت بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور اس سے ان کے لذت ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو تمام انبیاء سے بھی زیادہ اللہ کے مقرب تھے، اس لئے آپ کو بڑی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ان ہی میں سے ایک آزمائش کی شکل یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام انسانوں سے زیادہ امراض کی شدت برداشت کرنی پڑتی تھی، جیسا کہ متعدد روایات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیز بخار میں مبتلا تھے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کو بہت تیز بخار ہے، آپ نے فرمایا ہاں! مجھے تم میں سے دو آدمیوں کے برابر بخار ہے، میں نے عرض کیا کہ یہ اس سبب سے کہ آپ کو اجر دوہرا ملے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہی بات ہے، جس مسلمان کو کانٹا چبھنے کی یا اس سے زیادہ کی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کو اس طرح دور کر دیتا ہے جس طرح درختوں سے پتے جھڑتے ہیں''۔ (بخاری)

ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ ارشاد منقول ہے: ''میں نے کسی آدمی کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ درد میں مبتلا نہیں دیکھا''۔ (بخاری)

بے مثل حسن وجمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے بے مثل حسن وجمال کا ایسا پیکر بنایا تھا کہ آپ کا جسم اطہر ہر قسم کے نقائص سے مبرا اور حسن وجمال سے مرصع تھا، اور ایسا حسن وجمال اللہ نے آپ کو عطا فرمایا تھا کہ نہ آپ سے پہلے کوئی ایسا حسین پیدا ہوا اور نہ آپ کے بعد پیدا ہوگا، اس لئے کہ روئے زمین پر اللہ نے آپ ہی کو یہ ممتاز مقام عطا کیا کہ آپ کے جسم اطہر کا ہر ہر عضو حسن وجمال کے کمال کی مثال تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں ہے: ''اللہ نے جس نبی کو بھی بھیجا وہ حسین چہرہ اور اچھی آواز والے تھے، اور تمہارے نبی ان تمام

میں سب سے زیادہ حسین شکل اور اچھی آواز والے تھے‘‘۔(فتح الباری:۷/۲۱۰)

اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے حضرت حسان بن ثابت فرماتے ہیں:

وَأَحْسَنَ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ

وَأَجْمَلَ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّءاً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ

کَأَ نَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا، اور آپ سے زیادہ خوبصورت کو کسی عورت نے نہیں جنا، آپ ہر عیب سے پاک پیدا ہوئے، ایسا لگتا ہے کہ آپ کی تخلیق آپ کی مرضی کے مطابق ہوئی۔

ہرم بن سنان کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے زہیر شاعر نے ایک شعر کہا:

لو كنت من شيءسوى البشر كنت المضيءللیلة البدر

اگر آپ انسان کے علاوہ کچھ اور ہوتے، تو (میرے خیال میں) آپ ہی چودھویں رات کو روشن کرنے والے ہوتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ یہ شعر درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن کی ترجمانی کرتا ہے، اور آپ اس کے بلا مبالغہ مصداق ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چاندنی رات میں دیکھا، تو میں کبھی چاند کو دیکھتا اور کبھی آپ کے چہرۂ انور کو، اس حال میں مجھے آپ کا چہرہ چاند سے زیادہ حسین نظر آیا۔(ترمذی:۲۷۵۴)

غرض یہ کہ مختلف صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے انداز میں آپ کے حسن کی ترجمانی کی ہے، لیکن صحیح بات تو یہ ہے کہ آپ کے حسن و جمال کو الفاظ و تعبیر کے ذریعہ مکمل بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ چند جسمانی خصوصیتیں ہیں، جن سے اللہ نے آپ کو مزین کیا تھا اور جنہیں اللہ نے آپ کے جسم اطہر میں ودیعت فرما رکھا تھا، اور کیوں نہ ہو کہ آپ ہی تو خالق و قادر اللہ کے محبوب ہیں۔

اصلاحی مضامین

حبِ رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

از: مولانا معراج احمد حسامی*

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہر مومن کو قلبی محبت و تعلق ہوتا ہے، بلکہ یہ ایمان کا جزو اور دین کا لازمی حصہ ہے، خدا سے وابستگی کے لیے یہی معراج زندگانی ہے، جان نثاری کی ساری ادائیں جذباتِ محبت کا عملاً اظہار ہے، یہ وہ سدا بہار کیفیت ہے جو ایمانی زندگی کے پہلے مرحلے سے لے کر آخری سانس تک مومن کا سرمایۂ زیست ہے، دیہاتی ہو یا شہری، دامن کوہ میں بسیرا کرنے والا شخص ہو یا ستاروں پر کمندیں ڈالنے والا فرد، طالب علم ہو یا استاذ، ہر پروانے کو اپنی ارتقاء وافتخار کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ضرور محبت ہونا چاہیے۔

طاعت گزاروں کا مقام:-

لیکن محبت کے اس آئینے کو ہمیشہ صاف اور شفاف رکھنے کے لئے دین میں طاعت اور عمل کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے بار بار تعلیمات نبوی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں سے روشناس کرایا جاتا ہے تاکہ محبت کے مقدس عنوان پر خدا اور رسول کی شان کے خلاف کوئی اقدام نہ ہو جائے، حرکات وسکنات میں غیروں کی مشابہت نہ ہو جائے، اور امت غلو وتشدد افراط وتفریط کے جال میں نہ پھنس جائے۔

معروف تفسیر معارف القرآن میں امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ طاعت گزاروں کا ٹھکانہ انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین، کے ساتھ ہوگا، کیونکہ یہ ایسے محبین ہیں جو ساری زندگی محبت کا صحیح معیار جان کر اور اس کا بہترین صلہ مان کر طاعت پیہم اور جادۂ خیر الامم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا،" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک صحابیؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں آپ کو اپنی جان و مال، اہل وعیال سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں جب میں اپنے گھر میں اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہوتا ہوں ہو تو شوق زیارت مجھے بے قرار کرتا ہے، دوڑ کر آپ کے پاس آتا ہوں، آپ کا دیدار کر کے سکون حاصل کر لیتا ہوں، سوچتا ہوں کہ جنت میں آپ تو انبیاء کے ساتھ اعلیٰ ترین درجات میں ہوں گے میں جنت میں گیا بھی تو آپ تک نہ پہنچ سکوں گا، یہ سوچ کر بھی بے چین ہو جاتا

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا کلام سن کر کچھ جواب نہ دیا یہاں تک کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی مَنۡ یُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ " (۴۶۷/۲)

نیز صحیح مسلم میں ہیکہ " حضرت کعب بن اسلمی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رات (خدمت کے لئے) گزارتے تھے ایک رات تہجد کے وقت کعب بن اسلمی ؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ ضروریات لاکر رکھی تو آپ نے خوش ہوکر فرمایا مانگو کیا مانگتے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا اور کچھ نہیں۔اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو تم پر لازم ہے کہ سجدوں کی کثرت سے میری مدد کرو" (جلد:۲، رقم الحدیث:۱۱۲۲) یعنی اپنے او پر نوافل کی کثرت کو لازم پکڑلو۔

محبت کی منزل یہ بھی ہے

خواہ محبت خدمت کے جذبہ سے ہو یا تعلق کی بناء پر، اگر صحیح جذبۂ عمل سے خالی ہو تو محبت کے ہزار دعوے دن کو رات کہنے کے برابر ہیں، اظہار وابستگی کے لئے صرف یہی نہیں کہ یومِ ولادت کے نام سے پر تکلف دعوتوں کا نظم کیا جائے ،گلیوں ، بازاروں اور گھروں میں قمقمے سجائے جائے ،موٹر سائیکلوں ،گاڑی وغیرہ پر سبز جھنڈیوں سے مستانہ وار نعرہ بازی کی جائے حقیقت تو یہ ہے کہ اسوۂ رسول کو اپنا شیوہ بنا کر سادگی ،صبر و تحمل کو اپنی ذات میں جگہ دے، قناعت حلم، عجز، جیسی صفات پیدا کریں۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، نبی علیہ السلام نے فرمایا: جو کچھ کہو سوچ سمجھ کر کہو، تو اس نے تین دفعہ کہا خدا کی قسم مجھے آپ سے محبت ہے ، آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے محبوب رکھتے ہو تو فقر و فاقہ کے لئے تیار ہو جاؤ (کہ میرا طریق امیری نہیں بلکہ فقیری ہے) کیونکہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے فقر و فاقہ اس کی طرف اس تیزی سے آتا ہے جیسے پانی بلندی سے نشیب کی طرف بہتا ہے۔(ترمذی، جلد ۲، رقم الحدیث: ۲۳۵۰)

بہت سے مقامات پر عملی نمونہ بننے طاعت کے سانچے میں ڈھل جانے کی ترغیب دلائی گئ ،فضائل وثواب کو واضح کیا گیا، خدا اور رسول کے احکامات پر عمل آوری کے لئے آسان سے آسان تر مواقع فراہم کئے گئے، ایک ایک عمل پر اُبھارا گیا، دینی واُخروی منافع بتلائے گئے ، اور نقصانات سے آگاہ کیا گیا تاکہ ہر فرد حال دل پر غم والم کرنے کے بجائے فرحت وانبساط کے آثار اپنی زندگی میں محسوس کرے، پھر اس بات کا ملال نہ ہو۔

آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زھد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

طاعت خداوندی واتباع رسول سے کسی کو مفر نہیں، اپنا تجزیہ لے کہ اتباع رسول کی راہنمائی نہ کرنے والی محبت محض دھوکہ وفریب ہے، سنتوں کو طاق نسیان میں جگہ دینے والی محبت لفاظی اور نفاق ہے، غلامی کے عملی آداب سے محروم کر دینے والی محبت خود نمائی اور شہرت طلبی ہے، صرف بلند بانگ نعروں پر آمادہ کرنے والی محبت خود اس کی اہانت وذلت ہے، اور ضلالت وگمراہی بھی ہے، آداب رسول اور عشق رسول کو جاننے کے باوجود شانِ رسالت میں غلو گستاخی ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ادا پر مر مٹنے والے شخص کو چاہئے حب رسول کی لذت پا کر طاعت وزہد، صبر وتحمل کے زیور سے آراستہ ہو، قلبی وروحانی محبت کے ساتھ عملی محبت بھی آشکارا ہو، غرض ہر کام ایسا ہو جو آپ کی طاعت ومحبت کا پیغام اسلام کے سمجھنے کا جذبہ بیدار کرے، وہ خدا کے یہاں قبول ہو، اور بارگاہ رسالت وسیلۂ شفاعت ہو، پھر یہ کہنا بجا ہوگا، ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اللہ حسن عمل اور صحیح معنوں میں حب رسول کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

(بقیہ صفحہ ۳۴ سے)

غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ہم ابھی بھی غافل ہیں، کیا اب بھی ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم ربیع الاول میں ولادت رسول کے نام پر جشن منائیں؟ یہ خواب غفلت سے بیدار ہونے کا وقت ہے خدارا!! ظاہری دل آویزیوں پر نہ جائیے، خرافات کی ظاہری چمک دمک دیکھ کر دھوکے میں نہ آئیے، رسمی مجلسوں کی آرائش سے پہلے اپنی حالت زار پر رحم کھائیے، سڑکوں اور چوراہوں پر قندیل روشن کرنے کے بجائے اپنے قلوب کو نورِ ایمانی سے منور کرنے کی کوشش کیجئے، ان عقائد سے اپنا دامن چھڑائیے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا عہد کیجئے، تب جا کر قوم مسلم ایک بار پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہوگی ۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دھر میں اسمِ محمد سے اجالا کردے

اصلاحی مضامین

اُمتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

ازقلم: احمد عبید اللہ یاسر قاسمی

محبت کیا ہے

محبت ایک پاکیزہ جذبہ اور صحیح میلان کا نام ہے، محبت میں اگر جذبۂ صادق اور طلب حقیقی ہو تو اس میں اطاعت وفرمانبرداری، احترام واکرام کا عنصر خود بخود شامل ہوجاتا ہے، کوئی شخص دعویٰ کرے کہ اس کو فلاں سے محبت ہے مگر اس کی مرضی اور منشا کے مطابق اس سے پیش نہ آئے اور اس کے تقاضوں کو یکسر نظرانداز کردے تو کیا کوئی اس کے محبت کے دعویٰ کو تسلیم کرے گا؟ ہرگز نہیں! محبت تو محبوب کے تقاضے سے مشروط ہوتی ہے، اگر تقاضے اور منشاء کی تکمیل نہ ہو تو دعوے کے بے بنیاد اور کھوکھلا ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا، اسی طرح اگر ہمیں اُحمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی محبت ہے تو اس کے تقاضوں پر عمل ہونا چاہیے ورنہ تو عشق رسول کا دعویٰ سراسر بے بنیاد اور بے اصل ہوگا۔

ظہورِ قدسی

آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل ظلمت کدۂ عالم میں خداوندِ عالم نے اس عظیم الشان ہستی کو مبعوث فرمایا جو رسولوں کی سردار اور ختم نبوت کی علمبردار تھی، جو دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا کا ظہور پُرنور تھی، جسے ایسی مقدس شریعت سے سرفراز فرمایا گیا تھا جو تاقیامت جاری وساری رہنے والی ہے، جنہیں ایسا کلام معجز عطا فرمایا گیا تھا جو بنی نوع آدم کے لئے آخری سانس تک قانون کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے بعد کسی نبی یا رسول کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

کچھ بھی پیغام محمد کا تمھیں پاس نہیں

مگر افسوس اسی شریعت کے نام لیوا، محبت رسول کا دعویٰ کرنے والے مسلمانوں نے شریعت محمدی میں بہت ساری تحریفات کرکے ایسے رسوم ورواج اور بدعات وخرافات کو دین اسلام کا نام دے دیا ہے جس کا ماضی

میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا، دور نبوت، دور صحابہ، دور تابعین و تبع تابعین، کہیں سے بھی اس کی شہادت نہیں ملتی بلکہ ہندوؤں اور غیر مسلم اقوام کی صحبت اور جہالت نے مذہب اسلام کے متبعین میں بہت ساری خرافات کو رائج کر دیا ہے مقام حیرت ہے کہ جہاں ایک طرف سادہ لوح مسلمان ان باطل اور جاہلانہ رسوم ورواج کو اسلام کا نام دے کر ثواب کی امید پر بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے ہیں تو وہیں دوسری طرف افسوس کی انتہا نہیں رہتی ان حضرات پر جو شریعت کے علم کے باوجود محض نام و نمود، دنیوی اغراض، سیم و زر کی لالچ میں بدعات و رسومات، جاہلانہ عقائد اور باطل نظریات کو نبی کریم ﷺ کی سنت کا نام دے کر سادہ لوح عوام کو گمراہی کے عمیق اور تاریک غار میں دھکیل رہے ہیں؛ حد تو یہ ہے کہ اپنے بیانات اور بھڑکانے والی تقاریر میں صحیح العقیدہ مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگا کر ان سے تعلقات ختم کرنے کی اپیل کر رہے ہیں، میل جول اور سلام و مصافحہ پر قدغن لگا کر مسلم اتحاد و اتفاق کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ (فوا سفاہ) علامہ اقبال نے شاید اسی کی عکاسی کی ہے۔

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمد کا تمہیں پاس نہیں

بدعت کی اصل وجہ

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ہم تاریخ دانی اور سیرت رسول، اور اسلامی تعلیمات سے بہت حد تک ناآشنا ہیں، بلکہ اسلامی تعلیمات اور تاریخ کو موجودہ دور کے جدت پسند عناصر نے دقیانوسیت، اسلاف پرستی، تنگ نظری اور جمود کا نام دے کر مسلمانوں کو اس سے بتدریج دور کر دیا ہے؛ جسکے نتیجے میں احقاق حق اور ابطال باطل کی تمیز کا فقدان پوری امت مسلمہ کا المیہ ہے تبھی تو آئے دن بدعات وخرافات، باطل نظریات، اور غلط عقائد وافکار کی ایک بھر مار ہے جن سے امت مسلمہ کے اتحاد و سالمیت کو دن بہ دن نقصان پہنچ رہا ہے اہل باطل ان بدعتوں پر دین کا لیبل چسپاں کر کے عوام الناس کے سامنے پیش کرتے ہیں اور عوام جہالت و ناخواندگی کی وجہ سے اس پر عمل پیرا ہو جاتی ہے، رفتہ رفتہ وہ بدعتیں معاشرے میں پھیل جاتی ہیں اور اس کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں

عید میلاد النبی کی بدعات

عصر حاضر میں جہاں دیگر اور بھی بہت سی بدعات وخرافات ہیں وہیں ان میں سرفہرست "عید میلاد النبی" ہے، اگر حقائق اور غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو حقیقت میں نہ تو یہ عید ہے اور نہ ہی کوئی اور اسلامی تہوار، محض

ایک دکھاوا اور عیسائیوں کی نقل ہے جسے مسلم معاشرے کا ایک بڑا طبقہ دین سمجھتا ہے، جسے بطور عبادت بغرضِ حصولِ ثواب منایا جاتا ہے، جلسے جلوس کا اہتمام، محفل میلاد کا انعقاد ہوتا ہے، بازاروں اور گلی کوچوں کو برقی قمقموں سے منور کیا جاتا ہے، آلات موسیقی اور ڈھول کا استعمال ہوتا ہے، مال کا بے جا اسراف ہوتا ہے، سڑکیں بند کردی جاتی ہیں، جلسے جلوس کی وجہ فرض نمازوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے، مدحِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حد تجاوزی ہوتی ہے، حتی کہ نبی کو اللہ کی صفات میں برابری کا درجہ دیا جاتا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) یہ بھی عقیدہ رکھا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح مبارک ان کے ذکر کے وقت حاضر ہوتی ہے اور وہ عبادات کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، جبکہ یہ سب صریح بدعات ہیں جنکی کوئی اصل نہیں ہے؛ اللہ رحم فرمائے اس امت پر کہ اب تو عیسائیوں کی روش پر چل کر happy birthday day of Muhammad rasuullah کے نام پر cake بھی کاٹا جارہا ہے، مجلس میں یا رسول اللہ کا نام لے کر تالیاں بجائی جاتی ہیں۔ دل خون کے آنسو روتا ہے، کلیجہ منھ کو آجاتا ہے، آہ! اس بدبختی حرمان نصیبی کو کیا نام دیا جائے، اس عظیم الشان ہستی کے محترم ومعظم نام اور سیرتِ رسول اللہ کے باعظمت عنوان پر اس طرح کی بدعات وخرافات! کچھ دیر کے لیے شیطان کی پیشانی بھی احساسِ ندامت سے عرق آلود ہوجاتی ہوگی، شاید علامہ اقبال نے انہیں کے بارے میں کہا تھا

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

مانا کہ یہ ماہ سعادت ہے اِس مقدس ومسعود موقع پر کائنات کی سب سے عظیم ترین شخصیت کے وَجود نے اِس مبارک مہینے کی عظمتوں کو چار چاند لگائے ہیں، لیکن اس سے بڑھ کر ہمارے لئے یہ مقام افسوس ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ ہمیں سرفراز فرمایا تھا آج ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہا، جو روحانیت عطا کی تھی آج ہم اس سے تہی دست ہیں، جن نعمتوں سے امت کو بہرہ ور کیا تھا آج ہم ان سے محروم ہیں، ہاں یہ مقام غم وحسرت ہے عصر حاضر میں امت مسلمہ اپنی شامت اعمال کی بنا پر ذلت ورسوائی کے ساتھ جی رہی ہے ہم آقا سے غلام، حاکم سے محکوم، غنی سے مفلس، زَردار سے بے زر بلکہ بے گھر ہو چکے ہیں، کاش!! ہم یہ سوچتے کہ ہماری زبان جس مقدس ہستی کی محبت کا دم بھر رہی ہے، جس کے عشق کا دعویٰ کر رہی ہے کیا وہ حقیقت ہے؟ کیا عشق رسول کا یہی پیمانہ ہے؟ کیا اسکے تقاضے یہی ہیں؟ آج ہمارا عشق، صحابہ کے عشق رسول سے مختلف تو نہیں؟ کیا ہمارا ہر عمل اس دعویٰ محبت کا گواہ ہے؟ کیا ہمارا وجود اس عظیم ترین ہستی سے میل کھاتا ہے؟ کیا یہ طریقہ سنت رسول یا محبان رسول اور عاشقان نبی سے ثابت ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یقین رکھئے! یہ عشق ومحبت کا ڈھونگ،

فریبِ نفس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے، اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے علاوہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

محبت رسول کا حقیقی مطلب

محمد کی محبت دین حق کی شرط اول ہے
جو ہو اس میں خامی تو سب کچھ نا مکمل ہے

عشق سچا ہو تو سینہ جلتا ہے، ایک آگ اندر لگتی ہے، اور اندر ہی سلگتی ہے، عشق ہو جائے تو لب سل جاتے ہیں، اندرونی آلائشیں پاک ہونے لگتی ہیں، ایک تڑپ محبوب جیسا بننے کی، ایک لگن نقش پا پر چلنے کی کوئی لمحہ چین نہیں لینے دیتی، ہر لحظہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو ناگوار خاطر ہو، ہم غور کریں کہ کیا ہماری محبت ایسی ہی ہے؟ ہم جب اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو حضور اکرم ﷺ سے محبت کے اس دعوے میں کھو کھلے نظر آتے ہیں کیونکہ محب تو ہر حال میں محبوب کا تذکرہ حرزِ جاں رکھتا ہے، اور اگر ہماری محبت میں صداقت ہوتی، ہمارے عشقِ رسول میں ایک لگن ایک تڑپ ہوتی؛ تو آج امت مسلمہ کی یہ حالتِ زار ہرگز نہ ہوتی، مسلمان شریعت سے اس قدر بیگانہ نہ ہوتا، ہم حضور کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز کے عادی ہوتے، اِتباعِ سنت ہمارا طرۂ اِمتیاز ہوتا، اور تقوٰی وطہارت، پاکی ونظافت ہمارا شعار ہوتا. عربی کا ایک مشہور شعر ہے جو حقیقت کا غماز ہے

تعصي الا لَه وانت تُظهِرُ حبّه
هذا محالٌ وفي القياسِ بديع
لو كان حبُک صادقًا لَأَطَعْتَه
لِأَنَّ المحِبَّ لمنْ يُحِبُّ يُطِيع

تم زبان سے اللہ کی محبت کا اظہار کرتے ہو اور عمل سے اس کی نافرمانی اور مخالفت۔ محبت اور مخالفت کا یکجا ہونا از روئے عقل نہایت عجیب؛ بلکہ محال ہے۔ اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو تم یقینی طور پر اس کی اطاعت کرتے: کیونکہ محب وعاشق اپنے محبوب کا اطاعت گذار اور فرماں بردار ہوتا ہے۔

دھر میں اسمِ محمد سے اُجالا کر دے

آج امت مسلمہ بہت تکلیف دہ وروح فرسا حادثات سے گزر رہی ہے، امت مسلمہ کا وجود کئی صدیوں سے مسلسل ولگاتار نت نئے فتنوں، حادثوں وسازشوں اور کفار کی یورشوں کی زد میں ہے، بات ہمارے اِیمان تک آپہونچی ہے، ہمارے اعمال بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

فکر ونظر

غامدی فکر کی بنیادی گمراہی

از: مولانا یحییٰ نعمانی*

گزشتہ تقریباً بیس سال سے جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار کا ذرائع ابلاغ میں چرچا خاصی سرگرمی سے جاری ہے۔ یہ عاجز ان کی چیزیں اس وقت سے پڑھتا اور دیکھتا آیا ہے، جب غالباً ہندوستان میں ان کو معدودے چند لوگ جانتے تھے۔ ان کا رسالہ ''اشراق''، ''الفرقان'' میں آتا تھا اور کم از کم ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۸ء تک نظر سے گزرتا رہا۔ وہ اپنی نسبت محترم مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی طرف کرتے ہیں، میں ان کی چیزیں پڑھ کر محسوس کرتا تھا کہ مولانا مرحوم نے حد رجم کے سلسلے میں جس خطرناک جرأت اور شذوذ پر انتہا کی ہے، غامدی صاحب نے وہاں سے اپنا آغاز کیا ہے۔

پھر انٹرنیٹ نے ان کے افکار کی تبلیغ کا دائرہ بہت وسیع کر دیا۔ ادھر کچھ عرصے سے ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ ان کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لیکچرز سے کچھ لوگ ہمارے یہاں بھی متاثر ہونے لگے ہیں۔

مغربی تہذیب کے بین الاقوامی غلبے اور پھیلاؤ کی وجہ سے مسلمانوں میں ہر جگہ ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا ہے، جس کو اپنے مسلمان ہونے کے باوجود، اپنے خاص ماحول کے زیر اثر علماء اور اہل دین سے ایک نفسیاتی الجھن اور ذہنی دوری ہے۔ ایسے لوگ ہر گمراہ کن تحریک ودعوت کے سب سے جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ تجربہ ہو رہا ہے کہ یہی طبقہ غامدی صاحب سے متاثر ہو رہا ہے۔

میں سوچتا تھا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ہر متعدی مرض وبا کی طرح پھیلتا ہے، یہ بھی اسی طرح پھیل رہا ہے؛ لیکن ابھی مورخہ ۱۳/اپریل ۲۰۱۹ء کو معلوم ہوا کہ ان کے ادارے ''المورد'' کی بھارتی شاخ قائم ہو چکی ہے۔ جہاں سے ان کی کتابیں، رسائل اور ویڈیو لیکچرز وغیرہ کی نشر واشاعت کا کام ہو رہا ہے۔

اب مجھے اپنی دینی ذمے داری محسوس ہوئی کہ ان کے فکر کی بنیادی گمراہی کو واضح طور پر پیش کیا جائے؛ تاکہ ان کی چیزیں سننے اور پڑھنے والا واقف ہو کہ اُن کے افکار کی اصل بنیاد کس غلط فکری پر ہے اور ان کی آراء

* ناظم المعهد العالی للدراسات الاسلامیہ لکھنؤ

کیوں دین کی صحیح بنیادوں سے ہٹی ہوئی ہیں۔

جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی گمراہی اور اہل سنت واہل حق سے ان کا اصل انحراف کوئی معمولی قسم کا نہیں ہے۔افسوس کہ وہ مقام رسالت کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ان کے نزدیک بنیادی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے اہل ہی نہیں کہ اُن کے ذریعے (قرآن کے علاوہ) دین کا کوئی عقیدہ یا عمل انسانوں کو دیا جائے۔وہ منصب رسالت کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتے کہ وہ دین کا کوئی حکم قرآن کے علاوہ جاری کرے۔ہاں مشرکین مکہ اور یہود ونصاریٰ میں جو دینی روایت جاری چلی آرہی تھی غامدی صاحب کے نزدیک رسول اس کو اصلاح وتجدید کے ساتھ جاری کرسکتا تھا؛ لیکن اللہ اپنے رسول کو اپنے بندوں کے لیے کوئی نیا اور مستقل حکم دے اور وہ دین اسلام کا کسی درجے کا بھی حصہ قرار پائے یہ نبی ورسول کا منصب ومقام نہیں ہے۔

ان کا نظریہ ہے کہ حدیث کے ذریعے دین کا کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہوتا وہ واضح طور پر منکر حدیث ہیں ؛ البتہ ان کے انکار حدیث کی نوعیت مشہور عام منکرین حدیث سے قدرے مختلف اور نسبتاً کم درجے کی ہے۔ان کے فکر کی شاید سب سے بنیادی کتاب ''میزان'' ہے۔اس میں انھوں نے بڑی صراحت کے ساتھ اور کسی اشتباہ کے بغیر صاف واضح کیا ہے کہ حدیث دین کا ماخذ ہے ہی نہیں۔غامدی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> **''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی جو روایتیں زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنھیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔''**

کیا اس جملے میں کسی ایسی تاویل وتوجیہ کی کوئی گنجائش ہے جس کے ذریعہ یہ کہا جاسکے کہ غامدی صاحب منکر حدیث نہیں ہیں؟ اور پڑھیے اس جملے کے معاً بعد تحریر کرتے ہیں:

> **اس مضمون کی تمہید میں ہم نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے۔''**
>
> **(میزان ص:۶۱، ایڈیشن ۲۰۱۴ء)**

کیا اب بھی کوئی اشتباہ باقی رہ جاتا ہے؟

ہاں یہاں ایک چیز غور کرنے لائق ضرور ہے۔مندرجہ بالا عبارت میں غامدی صاحب نے حدیث کے بارے میں یہ بات کہہ کر کہ حدیث کے ذخیرے کی زیادہ تر روایات اخبار آحاد ہیں، غالباً یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ حدیث کو دین میں حجت نہیں مانتے اس کا سبب ان کا خبر واحد ہونا ہے۔اس طرح ان کے موقف کا

شذوذ واجنبیت اور عام مسلمانوں کے لیے اس سے وحشت کم ہو جائے گی؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عبارت میں اخبار آحاد کا لاحقہ بس ایک ''**شیٔ زائد**'' ہے۔ غامدی صاحب کے یہاں متواتر حدیث سے بھی دین کا کوئی نیا عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔ اوپر مذکوران کی عبارت میں غور کیجیے:

''**یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے**''

یہاں غامدی نظریے کی ایک خاص بنیاد اور جان لیجیے۔ جس سے اوپر کی عبارتوں میں حدیث کے بارے میں ان کے الفاظ کہ اس سے ''**عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا**'' اور یہ بات کہ حدیث ''**دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ نہیں بن سکتی**'' کا پورا مفہوم سمجھ میں آسکے۔

جناب غامدی صاحب نے اپنی اس کتاب میں، جو اُن کے فکر کی بنیاد ہے، بتایا ہے کہ، دین ہم تک دو صورتوں سے پہنچا ہے:

۱۔ قرآن مجید ۲۔ سنت

دھوکہ نہ کھا جایئے گا! صحابہ سے لے کر آج تک مسلمان سنت سے جس حقیقت کو مراد لیتے ہیں اور جس کا نام لیتے ہیں ذہن وتصور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے ملنے والی احادیث واعمال کا خیال آتا ہے، غامدی صاحب کے یہاں سنت اس معنی میں نہیں ہے؛ بلکہ یہ کچھ اور ہی تصور ہے۔

غامدی صاحب فرماتے ہیں:

''**سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے**'' (**جو عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ میں چلی آرہی تھی**)، ''**جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں جاری کیا**''[۱] (میزان، ص: ۱۴)

اسی مقام پر غامدی صاحب کہتے ہیں کہ دین کے ماخذ بس یہی دو ہیں اور کچھ نہیں۔ فرماتے ہیں:

دین لاریب، انہی دو صورتوں میں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کے اخبار آحاد جنھیں بالعموم ''حدیث'' کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ان کی تبلیغ وحفاظت کے لیے آپ نے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا؛ بلکہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا

۱؎ ''دین ابراہیمی کی روایت'' کے الفاظ سے یہی مفہوم واضح ہے کہ یہ وہ چیزیں تھیں جو عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ میں چلی آرہی تھیں اور غامدی صاحب نے میزان میں بھی اور اپنے بعض لیکچرز میں بھی اپنا یہی مدعا واضح کیا ہے۔

ہے کہ چاہیں تو انھیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو نہ پہنچائیں[۱]، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔(ص:۱۵)

غامدی صاحب کی بنیادی گمراہی انکار حدیث ہے۔ وہ ایک نئے طرز کے منکر حدیث ہیں۔ مجھے بڑا قلبی قلق رہا کہ جس وضاحت کے ساتھ اور متعین ودوٹوک (Pin Point) نشان دہی کے ساتھ ان کی یہ گمراہی عوام کے سامنے آنی چاہیے تھی، نہیں آئی۔ پاکستان میں ان کے افکار مختلف رسائل اور حلقوں میں زیر بحث آتے رہے، حیرت ہوتی تھی کہ ان کے افکار کے تجزیے میں، اہل حق کی نمائندگی کرنے والوں نے نہ جانے کیوں ان کی تردید میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کیں؟ جب کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

غامدی صاحب صرف انکار حدیث کے اس نظریے کا اظہار ہی نہیں کرتے؛ بلکہ اس کی عملی تطبیق بھی اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کیے ہوئے وہ تمام حقائق وواقعات اور وہ تمام احکام جو قرآن میں نہیں ہیں اور جن کو وہ ملت ابراہیمی کی پچھلی روایت میں بھی نہیں پاتے ان کو صاف دین وشریعت کا حصہ ماننے سے انکار کردیتے ہیں۔ غامدی صاحب کے اس تصور دین کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض ایسے عقائد کا بھی انکار کیا گیا جو متواتر احادیث سے ثابت ہیں اور جن کے انکار پر یقینی طور پر لازم آتا ہے کہ آدمی نے ایسی بات کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یقینی اور قطعی طور پر بتلائی تھیں۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کہہ چکے ہیں کہ

ملت ابراہیمی کی جو روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کی حیثیت سے جاری فرمائی اس کا نام ”سنت“ ہے اور اس کا دائرہ صرف اور صرف اعمال کی حد تک ہے۔ عقیدہ کی کوئی قسم اس سے ثابت نہیں ہوسکتی۔(میزان،ص:۵۸)

ان کے نزدیک حدیث اِس سنت کے علاوہ ہے اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ان کے نزدیک حدیث سے دین میں کوئی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوسکتا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو باتیں آخرت، جنت جہنم اور دیگر عقائد کے سلسلے میں ارشاد فرمائیں اور عالم غیب کے جن بے شمار واقعات وحقائق کی خبر دی، چاہے ان کی روایت متواتر ومشہور اور صحیح ہی کیوں نہ ہوں، ان سے دین اور اس کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک یہ چیز حدیث

[۱] یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث کی تبلیغ وحفاظت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا؛ بلکہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ چاہیں تو انھیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو نہ پہنچائیں، بالکل واقعے کے خلاف بات ہے۔ تاریخ علم حدیث کے موضوع پر لکھی ہر کتاب حدیث کی حفاظت واتباع اور اس کی تعلیم وتلقین نیز ابلاغ کے اہتمام کے ناقابل تردید شواہد سے بھری ہوئی ہے۔

کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین کے کسی عقیدے یا حکم کا ماخذ بن سکے۔

قارئین کرام غور فرمائیں کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ آپ ﷺ ساری زندگی اپنی مجلسوں میں جو گفتگو فرماتے رہے اور عالم غیب کی جو تفصیلی خبریں دیتے رہے اگر ان کا دین سے کوئی تعلق (بقول غامدی صاحب) نہیں ہے، تو کیا وہ سب فضول اور بے مطلب باتیں تھیں؟۔

مجھے پاکستان کے بعض ان جلیل القدر علماء پر شدید حیرت ہے، جنھوں نے اس جیسی گمراہی اور کج فکری کی تردید میں بڑی لمبی چوڑی علمی گفتگو کر کے غامدی صاحب کو کسی سنجیدہ علمی گفتگو کا مستحق سمجھا؟ اور ان کے ان نامعقول افکار پر فلسفیانہ گفتگوئیں کیں۔

اب غور فرمایئے وہ تمام احادیث جن میں مثلاً پل صراط اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول وغیرہ کی خبر دی ہے، غامدی اصول دین میں ان میں سے کسی پر دینی عقیدہ اور یقین رکھنا غلط ہے، اس لیے کہ حدیث کی یہ ''مجال'' ہی نہیں کہ وہ ہمیں کوئی عقیدہ دے سکے۔ واضح رہے کہ یہ وہ حقائق اور اخبار ہیں جن کی حدیثیں متواتر طور پر رسول ﷺ سے ثابت ہیں، یعنی صحابہ سے لے کر بعد کی نسلوں تک ہر زمانے میں اس کو آپ ﷺ سے نقل کرنے والے اتنے لوگ رہے ہیں کہ ان کا کسی کذب بیانی یا غلط فہمی پر متفق ہونا عقلاً محال اور ناممکن ہے اور یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں کی خبر دی ہے اور اپنی امت کو ان کے بارے میں بتلایا ہے۔

ایسی چیزوں کو علماء کی اصطلاح میں ''ضروریات دین'' کہتے ہیں۔ یعنی وہ باتیں جن کے بارے میں بدیہی یقین کے درجے میں یہ بات ثابت ہے کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے اور ان کی بابت اپنی امت کو تعلیم دی ہے۔

علماء امت کا اجماع و اتفاق ہے کہ ان ''ضروریات دین'' میں سے کسی ایک بات کا انکار کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ علم کلام و اصول اور دیگر اسلامی علوم کی کتابوں میں اس مسئلے کو پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر دور میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''اکفار الملحدین'' میں اس سلسلے میں عقل صریح کی روشنی میں اور علماء امت کی بے شمار تصریحات جمع کر کے ہر صاحب فہم کے لیے مسئلے کو بے غبار کر دیا ہے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ کے وہ ارشادات، جن کو ہر نسل میں اور ہر دور میں اتنے بہت سے لوگ نقل کرتے آئے ہوں، جن کے جھوٹ پر متفق ہونے اور سازش کرنے کی بھی گنجائش نہ ہو اور نہ یہ ممکن ہو کہ اتنے بہت سے

لوگوں نے بات سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی کی ہو، تو پھر ایسے ارشادات کو تسلیم نہ کرنا اور ان کے خلاف عقیدہ وفکر رکھنا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ خدا کے رسول کی تکذیب وتغلیط کی گئی ہے۔ ''رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ''۔

اپنے اسی اصول کی وجہ سے غامدی صاحب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور نزول ثانی کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ

''حضرت عیسیٰ کی وفات ہو چکی۔ اب نہ وہ زندہ ہیں نہ قیامت سے قبل دوبارہ تشریف لائیں گے۔'' (میزان: ۱۷۸)

حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حیات اور قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کے بارے میں یقینا خبر دی ہے اور پوری صراحت کے ساتھ دی ہے اور آپ سے اس کی روایات متواتر ہیں یعنی اتنے بہت سے راویوں نے ہر دور میں بیان کی ہیں جن کے غلطی کرنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی کتاب التصریح بما تواتر فی نزول المسیح میں ان روایات کو جمع کر دیا گیا ہے، جس کے بعد اس میں شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یقینا حضرت مسیح کے قبلِ قیامت دنیا میں تشریف لانے اور عظیم کارنامے انجام دینے کی خبر دی تھی؛ مگر غامدی صاحب کے یہاں اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ **حضرت عیسیٰ کی وفات ہو چکی ہے اور ان کے دنیا میں دوبارہ تشریف لانے کا عقیدہ بے حقیقت ہے۔** (میزان: ۱۷۸۔۱۸۰) اگرچہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے؛ مگر ان کے نزدیک یہ چیز تو حدیث کے دائرے میں ہی نہیں آتی ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدے یا عمل کا اضافہ ہو سکے۔

عقائد ہی کی طرح غامدی صاحب کے دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیے ہوئے ان احکام وقوانین کا کوئی درجہ نہیں ہے جن کی اصل قرآن میں نہیں ہے اور جو ''دین ابراہیمی کی روایت'' میں انھیں نہیں ملتے۔ ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے؛ اس لیے کہ انھوں نے اپنے فکر وتصور دین کا جو اصول پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اس سے خود بخود وہ تمام واجبات ومحرمات اور سنن ومستحبات دین کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں جن کی اصل قرآن میں نہ ہو اور جو دین ابراہیمی کی روایت کی حیثیت سے رائج نہ رہی ہوں۔ مثلاً بے شمار احکام ایسے ہیں جن کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں آیا ہے اور نہ ان کا کوئی سراغ ''دین ابراہیمی کی روایت'' میں اس طور پر ملتا ہے کہ عرب یا یہود ونصاریٰ ان پر کاربند تھے۔ مثلاً سونے کے برتنوں میں کھانا پینا حرام ہے، مردوں کے لیے سونا اور ریشم کے لباس حرام ہیں، عورتیں ماہواری ایام میں نماز نہیں پڑھیں گی اور بعد

میں ان کی قضا بھی نہیں کریں گی۔ داڑھی رکھنا اور بڑھانا واجب ہے۔ بات کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ وغیرہ نہ جانے کتنے حلال وحرام کے احکام ہیں جو غامدی صاحب کے اصول کے ذریعے دین کا حصہ نہیں رہیں گے اور ''خارج از اسلام'' قرار پائیں گے۔ ان کے تصور دین اور فکری اصول کا لازمی تقاضہ یہی ہے۔

غامدی صاحب کا حلقہ یہاں ایسے مقامات پر احادیث کی کچھ تاویل وتوجیہ، یا تضعیف، یا قرآنی آیات سے ان کے خلاف استدلال کی کچھ کوششیں کرتا ہے؛ مگر ان کو اس تکلف کی ضرورت ہی کیوں ہے؟ وہ مختصر یہ ہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمارے عقیدے میں حدیث سے دین میں کسی عقیدے یا عمل کا اضافہ نہیں ہوسکتا؛ اس لیے ہم ان باتوں کو نہیں مانتے؛ مگر عموماً وہ اور ان کے متبعین اپنا عقیدہ صاف کہنے کے بجائے پردہ داری سے کام لیتے ہیں؛ اسی پردہ داری کی وجہ سے ہمیں ان کے فکر کی اس بنیادی گمراہی کو کھولنا پڑ رہا ہے۔

چہ بے خبر ز مقام محمد عربیست

غامدی تصور دین میں رسول اللہ ﷺ کا یہ منصب نہیں ہے کہ ان کے ذریعے، قرآن کے علاوہ اور یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب میں چلی آ رہی دین ابراہیمی کی روایت کے علاوہ کو نیا دینی حکم قرار دیا جائے۔ وہ اگر حدیث میں دیے گئے کسی حکم کو قبول کرتے ہیں یا رسول اللہ کے حرام قرار دیے گئے کسی فعل کو حرام مانتے ہیں تو بس اسی وقت جب مشرکین عرب اور یہود ونصاریٰ کی دینی روایت میں اس کی سند مل جائے؛ اسی لیے ''میزان'' میں جو ان کے فہم دین کا مکمل صحیفہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو بھی احکام قبول کیے گئے ہیں، ان کی سند بھی ذکر کی گئی ہے کہ بائبل میں اس کی اصل ملتی ہے یا عربوں کی جاہلیت میں اس پر عمل تھا۔

رسول اللہ ﷺ سے تواتر سے ثابت ہے کہ آپ نے مسواک کو دینی عمل قرار دیا اور اس کا اجر وثواب بیان فرمایا۔ غامدی صاحب اس کو قبول کرتے ہیں مگر کیوں؟ اس لیے کہ جواد علی نے اپنی کتاب المفصل فی تاریخ العرب قبول الاسلام میں المحبر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ عرب مسواک کیا کرتے تھے (میزان: ۶۴۱)۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے قول کو دین قرار پانے کے لیے ابولہب، ابوجہل اور پولس کی سند کی ضرورت ہے!!

میزان میں غامدی صاحب نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو دین تسلیم کیا ہے کہ جس کسی کا قربانی کا ارادہ ہو وہ ذی الحجہ کے شروع سے قربانی کرنے تک نہ بال کاٹے نہ ناخن (صحیح مسلم)۔ اس پر کسی نے سوال

کیا کہ آپ نے اس حکم نبوی کو دین کیسے مان لیا؟ یہ تو آپ کے اصول کے خلاف ہے کہ کسی ایسی چیز کو دین مانا جائے جس کی اصل یہود و نصاریٰ یا مشرکین عرب میں چلی آرہی ملت ابراہیمی کی دینی روایت میں نہ ملتی ہو۔ اس کے جواب میں غامدی صاحب کے رسالے (شمارہ نومبر ۲۰۱۸ء) میں بڑی تفصیلی تحریر شائع کی گئی، جس میں دکھایا گیا کہ یہ چیز ملت ابراہیمی کی روایت میں موجود تھی اور اس میں بائبل کے بھی بہت سے حوالے دیے گئے کہ اس لیے حدیث کے اس حکم کو دین کا حصہ مانا گیا ہے۔

عجب بات یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے ہم کو ایسے بہت سے احکام ملے ہیں جن کا کوئی سراغ ملت ابراہیمی کی قدیم و موروث دینی روایت میں نہیں ملتا اور قرآن نے بھی ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے؛ مگر غامدی صاحب ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ عیدین دین کا حصہ ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کیا عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا رواج عہد نبوی میں ملت ابراہیمی کی روایت میں کہیں تھا؟ عرب کے مشرکانہ تہوار اور میلوں ٹھیلوں کو ختم کر کے حدیث نے ہم کو عیدین کے دینی تہوار دیے۔ یہ سب حدیث ہی سے ہم کو ملا ہے۔ پھر وہ عید کی نماز کو بھی لازم قرار دیتے ہیں۔ کیا عیدین کا کوئی تذکرہ قرآن میں ہے؟ کیا مشرکین مکہ بیت اللہ میں یا عیسائی ایلیاء میں اس کو قائم کرتے تھے؟ کیا یہود مدینے میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے؟

غامدی حلقے کو نماز جنازہ کا بھی قائل نہیں ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ انھوں نے اپنے نزدیک دین کے جود و اور صرف دو مآخذ قرار دیے ہیں یعنی قرآن اور ''ملت ابراہیمی کی وہ روایت جس کو آپ ﷺ نے باقی رکھا اور جاری فرمایا'' اس روایت میں ہم کو نماز جنازہ نہیں ملتی ہے؛ مگر غامدی صاحب اس کو دین کا حصہ مان رہے ہیں۔ یہ کسی طرح خدا کی عبادت والی وہ نماز نہیں ہے، جس کا حکم ''اقیموا الصلوٰۃ'' کہہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اصل میں میت کے لیے دعا کی ایک واجب رسم ہے اور کوئی شک نہیں کہ خدا کی عبادت والی نماز سے بالکل الگ ایک مستقل حکم اور دین کا مستقل حصہ ہے۔ یہ تمام وہ احکام ہیں جن کو اللہ کی وحی غیر متلو کے زیر حکم منصب رسالت سے دین قرار دیا گیا۔

بوالعجبی کی انتہا:

غامدی صاحب کے لیے ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ ان کے بقول، قرآن نے جانوروں میں سے صرف چار چیزوں یعنی مردار جانور، خون (دم مسفوح) غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے جانور اور سور کے گوشت کی حرمت بتائی ہے۔ باقی بہت سی اشیاء کے اللہ کی طرف سے حرام ہونے کی خبر ہمیں صرف رسول اللہ ﷺ سے ملی ہے۔

مثلاً تمام درندے جیسے شیر، چیتا، کتا، بھیڑیا، جانوروں میں ہاتھی گدھا، نیز پرندوں میں چیل، عقاب، گدھ، وغیرہ تمام امت ان کو صرف ارشادِ رسول ہی کی وجہ سے حرام مانتی آئی ہے۔

تو غامدی صاحب کیا کریں؟

اگر یہ کہیں کہ یہ سب چیزیں حرام نہیں ہیں؛ اس لیے کہ ان کے نزدیک حدیث سے تو شریعت ثابت ہی نہیں ہوتی، تو بڑی گھناونی بات ہوگی۔

اور اگر ان چیزوں کو حرام کہیں تو اپنی فکر کی ساری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ اس مخمصے کا انھوں نے ایک حل نکالا اور کیا ''خوب'' حل نکالا!!

انھوں نے ارشاد فرمایا کہ

''یہ دراصل انسان اپنی فطرت سے ہی جانتا ہے کہ یہ چیزیں گندی ہیں اور کھانے پینے کے لیے نہیں بنی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کو جو حرام قرار دیا ہے وہ کوئی شریعت کا بیان اور حکم نہیں ہے۔ محض فطرت انسانی کا بیان ہے۔ ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لوگوں (یعنی پوری امت کے تمام علماء) سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ان باتوں کو شریعت کا بیان سمجھ لیا حالاں کہ وہ صرف فطرت کا بیان ہیں؛ حالاں کہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن نے بیان کی ہیں ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

غامدی صاحب کہتے ہیں:

''جانوروں کی حلّت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں''۔ یعنی مردار جانور، خون (دم مسفوح) غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جانور اور سور کا گوشت؛ چنانچہ قرآن نے بعض جگہ ''قل لا أجد فی ما اوحی إلی'' اور بعض جگہ ''إنما'' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔۔۔۔ (میزان، ص: ۳۶)

باقی وہ چیزیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام قرار دیا جیسے تمام درندے جیسے شیر، چیتا، کتا، بھیڑیا، جانوروں میں ہاتھی، گدھا، نیز پرندوں میں چیل، عقاب، گدھ وغیرہ۔ ان کے بارے میں جنابِ موصوف فرماتے ہیں ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان باتوں کو شریعت کا بیان نہیں سمجھتے، محض فطرت انسانی کا بیان سمجھتے ہیں۔

فرماتے ہیں:

انسان کی فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔ اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دسترخوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

بعض روایتوں میں (یہ جو) نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے، اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اُسی فطرت کا بیان ہے، جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، درآں حالے کہ شریعت کی اُن حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

یعنی کتا، بلی، گدھا، سانپ، بچھو، چیل اور گدھ کھانا محض فطرت انسانی کے خلاف ہے، کوئی کھائے تو یہ دینی طور پر حرام نہیں ہے۔

غرض بوالعجبیوں اور تضادات کی ایک دنیا ہے۔ غامدی صاحب نے ایک غلط تصور دین قائم کرلیا پھر خود ان کو اس کے نتائج کا یارا نہ رہا۔ یہاں غامدی صاحب کا اصول ان سے تقاضہ کرتا تھا کہ وہ کہیں کہ حدیث سے دین میں چوں کہ کوئی نیا حکم ثابت ہی نہیں ہوسکتا اور ''**یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے**'' (میزان، ص:۶۱، ایڈیشن ۲۰۱۴ء)۔ اس لیے ان کی حرمت کا خیال شریعت سے ثابت نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ انھوں نے کتے، بلی، گدھے، شیر چیتے، چیل، باز اور سانپ بچھو کو حرام سمجھ رکھا ہے۔

جب غامدی صاحب کا اصول یہ ہے کہ ''**یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے**'' اور اس سے ''**دین میں کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا**''۔ (میزان، ص:۱۵) تو پھر یقیناً وہ کتے، بلی، چیتے، شیر، گدھے اور سانپ بچھو کو دین میں حرام نہیں کہہ سکتے۔

غامدی صاحب کے انکار حدیث کا یہی منطقی تقاضہ اور لازمی نتیجہ ہے؛ مگر وہ بہت ذہین آدمی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ تو ان کے عقیدے و مسلک سے لوگوں کو متنفر کردے گا اور پھر کون مسلمان ان کے لیکچرز سنے گا اور

ان کو ''اسلامی اسکالر'' مانے گا؟ اور کون ان کے حقیقی فکر کے نتائج کو سن کر کان نہ پکڑے گا کہ ایسی گمراہی سے خدا کی پناہ!!

اس لیے انھوں نے ایک مضحکہ خیز تاویل اختیار فرمائی اور ایسا عجیب وغریب جوڑ بٹھایا کہ یہ کسی طرح ذہن قبول نہیں کرتا کہ غامدی صاحب جیسا ذہین وزیرک انسان ایسی لچر باتوں پر کبھی اپنے دل کو مطمئن کرسکا ہوگا۔

کل کو غامدی صاحب کا کوئی خوشہ چیں ان کے اسی اصول کو لے کر یہ کہہ سکتا ہے:

''استاذ امام'' کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ کتا، بلی، لکڑ بگھا، چیتا، ہاتھی، گدھا اور گدھ، چیل وغیرہ انسانی فطرت کی رو سے کھانے پینے کی چیز نہیں۔ نہ جانے کتنی اقوام کی مرغوب غذا میں کتا اور بندر شامل ہے۔ چینیوں کے یہاں سانپ نہایت لذیذ وپسندیدہ کھانا ہے۔ جن اقوام نے یہ چیزیں نہیں کھائیں یہ ان کے ''کلچر'' کی روایت ہے۔ یہ مزعومہ کہ ان چیزوں سے اِبا فطرت انسانی میں ودیعت ہے اس کی کوئی دلیل سوائے ''استاذ امام'' کے ذوق کے نہیں۔

رہی یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے؟ تو وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے موقف میں جس کو ہم نے ''پوری قطعیت کے ساتھ واضح'' کردیا ہے، **''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے''**۔ لہٰذا کتے، چیتے، بلی، ہاتھی، بندر، سانپ، بچھو کو لوگوں نے غلط حرام قرار دے دیا ہے۔ نہ فطرت انسانی کی رو سے یہ چیزیں کھانے کے قابل ہیں اور نہ خدا کی شریعت کے محرّمات میں سے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس شاگرد رشید کا موقف بڑا کریہہ اور وحشت انگیز ہے؛ لیکن ہے سو فیصد غامدی صاحب کے اصول ومنطق اور ان کے دینی عقیدہ پر قائم۔ دین کے اگر غامدی اصول قبول کرلیے جائیں تو شریعت کے تین چوتھائی حصے کو دَریا بُرد کرنا بس اسی جیسی چند تقریر ہائے دل پذیر کا محتاج رہ جائے گا۔

سارے انحراف کی بنیاد

سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ورسالت کے ۱۴ صدیوں بعد ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ دین کا ماخذ کیا ہے، یہ مسلمانوں کے اگلوں نے سمجھا نہ پچھلوں نے۔ میں وہ فرد فرید ہوں جو یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہوا ہے کہ دین کا ماخذ کیا ہے۔

حیرت سے دماغ ششدر رہ جاتا ہے کہ غامدی صاحب جیسا ایک اچھا خاصا سمجھدار آدمی کیسی باتیں کر رہا ہے! وہ کہتا ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے صحابہ ہزار ہا ہزار کی تعداد میں ہوئے، یہ بھی مانتا ہے کہ وہ چمن انسانیت کے گل سر سبد اور شجر اسلام کے بہترین ثمر تھے اور یہ بھی کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کی تبلیغ و تفہیم میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر ساتھ ہی کہتا ہے کہ رسول، اپنے ان صحابہ کے لیے جو خلاصۂ انسانیت تھے، یہ تک واضح نہ کر سکا کہ اسلام کے ماخذ کیا ہیں؟ صحابہ کے بعد امت کی جو ساری علمی تاریخ ہے جس کے تسلسل میں تابعین عظام، ائمہ اسلام، اور بے شمار علماء کی قطاریں کھڑی ہیں وہ سب دین کے معاملے میں (معاذ اللہ) ایسے جاہل و کم مایہ ہوئے کہ ان کو یہ تک پتہ نہیں چل سکا کہ دین ان کو کہاں سے لینا ہے؟

آج غامدی صاحب نے دنیا کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ

> **''دین کے لاریب صرف دو ماخذ ہیں: ایک قرآن اور دوسرے ملت ابراہیمی کی وہ روایت جو یہود و نصاریٰ میں اور عرب کے مشرکین میں چلی آ رہی تھی، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تائید و تصویب کے ساتھ امت میں دین کی حیثیت سے جاری کیا۔ ان دونوں کے علاوہ کوئی چیز نہ دین ہو سکتی ہے اور نہ اسے دین قرار دیا جا سکتا ہے''۔**

پھر طرفہ دیکھیے! غامدی صاحب اس قدر بڑا دعویٰ فرماتے ہیں اور دین کا ماخذ و اصل (Source) ایسا نیا بیان کرتے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں بتایا اور ماشاء اللہ پوری کتاب ''میزان'' اپنے اس دعوے کی دلیل سے خالی!! یعنی دلیل کے نام پر کوئی معمولی سی چیز بھی اس کی جناب پیش نہیں فرماتے کہ محمد رسول اللہ کا کوئی حکم یا تحلیل و تحریم کا کوئی ارشاد صرف اسی وقت دین اور شریعت قرار پائے گا جب وہ ملت ابراہیمی کی روایت کا حصہ ہو۔ اتنا بڑا دعویٰ اور حجت بس یہ کہ میں یہ سمجھتا ہوں!! سبحانَ مظہر العجائب! خدایا! رحم فرما۔

اس تحریر کا مقصد غامدی صاحب کی تردید اور ان کے افکار کا علمی جائزہ لینا نہیں ہے۔ بس مطمح نظر یہ ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ بنیادی طور پر ایک خاص طرح کے منکر حدیث ہیں اور یہ کھول کر سامنے رکھ دیا جائے کہ ان کے فکر و مسلک کے کیا لازمی نتائج ہیں۔

انھوں نے اپنے نزدیک جو دین طے کیا اور اپنی کتاب میزان کے دیباچہ میں اس اظہار و اعلان کے ساتھ پیش کیا ہے:

> ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔''

اس میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ قرار پاسکے۔ ہاں اگر رسول اللہ ﷺ کے حکم وارشاد کی تائید "ملت ابراہیمی کی روایت" سے ہوجائے تو آپ ﷺ کا حکم دین میں جگہ پاجائے گا۔ ورنہ چاہے آپ ﷺ کسی چیز کو حرام کہیں، یا اس کے مرتکب پر لعنت بھیجیں، یا اس پر اللہ کے عذاب کی وعید سنائیں، یا کسی چیز کو من جملہ واجبات فرمائیں اور حکم دیں، وہ چیزیں ضروری یا دینی حکم کا درجہ نہیں پاسکیں گی۔ ایسے موقعے پر کسی خوبصورت سی عبارت کے ذریعے ان احکامِ رسول کو غامدی دین میں "لغو" قرار دے دیا جائے گا؛ اس لیے کہ ان کے یہاں تو "یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے"۔

غامدی صاحب اپنی ان واضح عبارتوں کے باوجود اگر یہ اصرار فرماتے ہیں کہ حدیث وسنت کے بارے میں ان کا اور عام علماء سلف کا موقف حقیقت میں ایک ہی ہے، اختلاف صرف اصطلاح کا یا علمی ترتیب کا ہے، جیسا کہ انھوں نے بھی کہا ہے اور ان کے کارپردازان وکلاء صفائی گھما پھرا کر کہتے رہتے ہیں (اور ہماری بھی دلی دعا ہے کہ ایسا ہوجائے) تو ان کو واضح طور پر اپنی اِن مذکورہ عبارتوں سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ عبارتیں انھوں نے اپنی سب سے مرکزی کتاب میں لکھی ہیں۔ ان کا مطلب بالکل واضح ہے اور خود ان کے رسالے نے اسی مفہوم کے مطابق ان کی آراء کی توجیہ کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ان کی رائے کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی حکم یا عمل اسی وقت دین قرار پاتا ہے جب اس کی اصل ملت ابراہیمی کی قدیم روایت میں پائی جاتی ہو۔

اس بنیادی مسئلے کی وضاحت کے بعد ان کی تاویلات وتوجیہات اور اختراعات کے تفصیلی جائزے کی ضرورت شاید نہیں رہتی۔ ان کی بعض آراء صحیح ہوسکتی ہیں؛ لیکن ایسی بنیادی گمراہی کا حامل شخص دین کے سلسلے میں لائق توجہ قطعاً نہیں رہتا۔ ایسے حضرات سے دین سیکھنا بڑی غلطی کی بات ہے۔

ہم اللہ سے جہاں اپنے لیے بھی ہدایت واستقامت اور توفیق ارزانی کی دعا کرتے ہیں، اُن کے لیے بھی کرتے ہیں کہ اللہ ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین حق کی سمجھ اور امت کی بہترین نسل صحابۂ کرام کے طرز پر دین کے فہم کی توفیق عطا فرمائے۔

مطالعہ کی میز پر

(۱) نام کتاب: اطاعتِ والدین کے حدود

صفحات: ۱۶۸ قیمت: درج نہیں ہے۔

ناشر: فیصل انٹرنیشنل۔۔۔۔

(۲) نام کتاب: رمضان المبارک معروفات ومنکرات

صفحات: ۵۴۴ قیمت: درج نہیں ہے

ناشر: مکتبہ احسان لکھنؤ

(۳) نام کتاب: اصلاح الرسوم (مسہّل، محقَّق، مخرَّج)

صفحات: ۴۵۲ قیمت: درج نہیں ہے

مولف ومرتب: مفتی احمد اللہ نثار قاسمی

(۴) نام کتاب: مسلم لڑکیوں کا ارتداد، اسباب وحل

صفحات: ۳۰۶ قیمت: درج نہیں ہے

مبصر: حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہٗ

مفتی احمد اللہ نثار قاسمی آندھرا پردیش کے ضلع کڑپہ سے تعلق رکھتے ہیں، حیدرآباد کے معروف ومقبول مدرسہ خیر المدارس بورابنڈہ میں مدرس ہیں، اچھے مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ مشق مصنف اور فکرمند داعی بھی ہیں، تصوف وسلوک سے بھی وابستہ ہیں، جواں عمری میں بہت کام اللہ پاک لے رہا ہے، مذکورہ کتابیں انہیں کی تالیف یا تحقیق وترتیب سے مُنصّہٗ شہود پر آئی ہیں، پہلی کتاب حقوقِ والدین میں افراط وتفریط کے درمیان راہِ اعتدال دکھانے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے، یہ کام معروف مصنف وداعی مولانا مفتی ابوبکر جابر قاسمی کے اشتراکِ عمل کے ساتھ تیار کی گئی ہے۔ دوسری کتاب رمضان المبارک کے عنوان پر اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں معروفات کے ساتھ منکراتِ مروجہ کی جانب بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ تیسری کتاب حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ہے تاہم موصوف نے اس پر تسہیل، تحقیق اور تخریج کا کام بڑی محنت سے کیا ہے، اس طرح یہ کتاب استفادہ کے لئے بہت آسان ہوگئی ہے، نیز علاقۂ جنوب کی بعض رسومات کو بھی اس میں شامل کرلیا گیا ہے۔ چوتھی کتاب میں حالاتِ زمانہ سے متأثر ہوکر موصوف نے معاشرتی بے راہ روی کے وجوہ اور حل تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، قابل علماء کرام کی تقاریظ خود اس کی اعتباریت کے لئے کافی ہے۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان مساعئ جمیلہ کو شرفِ قبول عطا فرمائے، اور مؤلف کو جزائے خیر دے اور مسلمانوں کو ان کتب سے استفادہ کی توفیق دے۔ آمین والسلام علی النبی الکریم

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مولانا مفتی ندیم الدین قاسمی*

مردوں کا سر پر چوٹی بنانا

سوال: کیا کسی مرد کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ نماز یا نماز کے باہر اپنے بالوں کو چوٹی کی شکل میں بنائے؟

جواب: مرد کا اپنے بالوں کو چوٹی کی شکل میں بنانا نماز یا خارج نماز دونوں حالتوں میں ناجائز ہے۔

(مستفاد از فتاویٰ دار العلوم زکریا ص ۳۴ / ۷)

ڈیزائن والے برقعہ کا حکم

سوال: آج کل بعض عورتیں خوبصورت ڈیزائن والے برقعے اور عبایا، پہنتی ہیں ان کا کیا حکم ہے؟

جواب: معاشرے کو پاکیزہ رکھنے فتنہ اور فساد کے سد باب، عورتوں کی عزت وآبرو کی حفاظت کے خاطر شریعت مطہرہ نے خواتین کو باپردہ گھر سے باہر نکلنے کی تعلیم دی ہے اور یہ مقصد ایسے برقعے سے حاصل ہوسکتا ہے جس برقعہ میں درج ذیل باتوں موجود ہوں؛

۱) پورے جسم کو چھپانے والا ہو، چہرہ اور ہاتھوں کو بھی چھپائے۔ (۲) اتنا موٹا اور ڈھیلا ہو کہ جس سے اعضاء مستورہ یا اس کی ساخت نمایاں نہ ہو۔ (۳) ایسے خوبصورت نقش ونگار والا اور پرکشش نہ ہو جو مردوں کو اپنی طرف مائل کردے کیونکہ برقعے سے مردوں کی توجہ ہٹانا مقصود ہے۔ اور یہ ڈیزائن والا برقعے تو توجہات کو بڑھاتے ہیں۔ (مستفاد: از فتاویٰ دار العلوم زکریا ۹۶ / ۷)

عورتوں کا ڈرائیونگ کرنا

سوال: کیا عورت اپنی ضروریات کے لئے ڈرائیونگ کرسکتی ہیں جب کہ اس کا شوہر دوسری ضروریات میں مشغول ہوتا ہے؟

جواب: مکمل پردے کی رعایت کے ساتھ ڈرائیونگ کی اجازت ہے کیونکہ بعض مرتبہ عورتوں کو گاڑی چلانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم زکریا ۲۳۴ / ۷)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کم سن بچیوں کا محفلوں میں نعت وغیرہ پڑھنا۔

سوال: کم سن بچیوں کا جلسے وغیرہ میں مردوں کے سامنے نعت، نظم وغیرہ ترنم سے پڑھنا کیا درست ہے؟

جواب: جلسہ یا مجمع میں کم سن بچیوں کا نعت وغیرہ ترنم سے پڑھنا جائز اور درست ہے لیکن بالغ لڑکیوں سے غیر محرم کا سننا اور ان کا پڑھنا فتنہ کی وجہ سے درست نہیں۔ (فتاویٰ دار العلوم زکریا ۶۴۰/ ۷)

کمپیوٹر پر آیات قرآنیہ لکھنا

سوال (۵): کمپیوٹر پر بلا وضو بسم اللہ الرحمٰن اور آیات قرآنیہ لکھنا کیسا ہے؟

جواب: کمپیوٹر پر لکھنے میں چونکہ ہاتھ قرآن کے حروف پر نہیں پڑتا لہذا اس کے ذریعہ بلا وضو تسمیہ اور آیاتِ قرآنیہ لکھنا درست ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ باوضو کمپیوٹر کا استعمال کرے لیکن جب پرنٹ نکالے تو ہاتھ لگانے کے لئے وضو کا ہونا لازم ہے۔ (کتاب النوازل ۶۲/ ۱۵)

عورتوں کا بیوٹی پارلر جانا

سوال: آج کل خواتین خصوصاً لڑکیاں بیوٹی پارلر میں اپنے کو سجانے اور سنوارنے کے لئے جاتی ہیں اور اپنی بھویں منڈواتی ہیں، تو کیا یہ درست ہے؟

جواب: بیوٹی پارلر میں جا کر میک اپ کرانا محض فیشن پرستی، تصنع اور فضول واسراف ہے جس سے بچنا لازم ہے عورت کو جو بھی زینت کرنی ہے اپنے گھر میں ہی کرے۔ خاص اسی مقصد سے بیوٹی پالروں میں جانا ایک مستقل فتنہ اور بے حیائی ہے، اور بھوؤں کے بال بالکل سرے سے منڈوانا ناجائز ہے، لیکن اگر کسی عورت کے بھویں ایسی گھنی ہوں کہ بری معلوم ہوتی ہو تو شوہر کی خوشنودی کے لئے انہیں باریک کرنے کی گنجائش ہے۔

(کتاب النوازل: ۴۶۷/ ۱۵)

غیر مسلم کو قرآن کا ترجمہ دینا

سوال (۷): کیا ہم غیر مسلم کو قرآن کریم کا مترجم نسخہ دے سکتے ہیں اگر وہ ہم سے طلب کریں؟

جواب: غیر مسلم کو قرآن کریم کا مترجم نسخہ دینا دو شرطوں کے ساتھ جائز اور درست ہے:

(۱) غیر مسلم سے بے ادبی اور بے حرمتی کا اندیشہ نہ ہو۔

(۲) طہات کا لحاظ رکھتا ہو اگر جنابت میں ہو تو غسل کرے اور اگر غسل کیا ہوا ہو تو وضو کے لئے کہا جائے۔

(فتاویٰ دار العلوم زکریا ۷۳۰/ ۷)